ماہنامہ

آہنگ

۱۹۴۸ء سے مسلسل اشاعت

قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا

جولائی 2026ء

پاکستان میں خواتین سے
متعلق او آئی سی کانفرنس

أَفْضَلُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

"تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن حکیم سیکھے اور سکھائے" (صحیح بخاری)

جید قراء کرام کی آواز میں تلاوتِ قُرآن
مستند اُردو ترجمہ کے ساتھ تَفہیمِ قُرآن

قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا

ماہِ رمضان کی بابرکت ساعتوں میں اپنی سماعتوں کو تلاوتِ کلامِ مجید سے بہرہ ور کرنے کیلئے ریڈیو پاکستان کے
ایف ایم چینل **93.4 "صوتُ القرآن"** کو ٹیون کریں یا اپنے موبائل فون پر ریڈیو ایپ **ریڈیو پاکستان آفیشل** ڈاؤن لوڈ
کرنے کے بعد لائیو سٹریم کے ذریعے اس چینل کی نشریات سُنیں

الحمدللہ!

ملک کے ساٹھ شہروں اسلام آباد، لاہور، کوئٹہ، ملتان، فیصل آباد، نارووال،
بہاولپور، حیدر آباد، خیر پور، مٹھی، گلگت، سکردو، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان،
گوادر، سبی، میرپور، پشاور، کراچی اور دیگر شہروں میں
"صوتُ القرآن" کی یہ نشریات **2015** سے جاری ہیں

ان شاءاللہ

ریڈیو پاکستان، وزارتِ اطلاعات ونشریات
حکومتِ پاکستان

اداریہ

جولائی کا مہینہ پاکستان کی قومی زندگی کی تقویم کا ایک ورق نہیں بلکہ تاریخ، فکر اور اجتماعی شعور کی کئی روشن یادوں کا امین ہے۔ یہ مہینہ ہمیں اُن اقدار کی طرف متوجہ کرتا ہے جن پر قوموں کی تعمیر استوار ہوتی ہے۔ محرم الحرام ہمیں حضرت امام حسین اور اہلِ بیتِ اطہار کی بے مثال قربانی، صبر، استقامت اور حق پر ثابت قدم رہنے کے عظیم درس کی یاد دلاتا ہے۔ واقعۂ کربلا صرف تاریخ نہیں بلکہ ہر دور کے مسلمانوں کے لیے ایمان، ایثار، وفا اور ظلم کے سامنے ڈٹ جانے کا ابدی پیغام دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت امام حسین کی سیرتِ مبارکہ سے صبر، تقویٰ، حق گوئی اور استقامت کا سبق سیکھنے اور وطنِ عزیز پاکستان کی ترقی امن وخوشحالی کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آج پاکستان کو اِنہی اوصاف کی ضرورت ہے تاکہ قومی وحدت، باہمی احترام اور اجتماعی ذمہ داری کا شعور مزید مستحکم ہو۔

جولائی کا مہینہ مادرِ ملت فاطمہ جناح کی ولادت کی یاد بھی تازہ کرتا ہے۔ فاطمہ جناح نے تحریکِ پاکستان کے دوران قائدا عظم محمد علی جناح کے شانہ بشانہ قوم کی رہنمائی کی اور قیامِ پاکستان کے بعد جمہوری اقدار، آئینی بالادستی اور خواتین کے باوقار کردار اور قومی یکجہتی کے لیے اپنی خدمات انجام دیں۔ مادرِ ملت کا کردار آج بھی ہر پاکستانی بالخصوص نوجوان نسل کے لیے عزم، دیانت اور حبُ الوطنی کا روشن استعارہ ہے۔

عصرِ حاضر میں پاکستان قومی ترقی کے سفر کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر بھی مثبت اور تعمیری کردار ادا کر رہا ہے۔ حکومت کی جانب سے علاقائی تعاون، اقتصادی استحکام، عوامی بہبود، خواتین کے بااختیار کردار اور عالمی برادری کے ساتھ مؤثر روابط کے فروغ کے لیے جاری کاوشیں اِس عزم کی مظہر ہیں کہ پاکستان امن، ترقی اور باہمی تعاون پر مبنی مستقبل کی تشکیل کے لیے سنجیدگی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ بین الاقوامی فارمز پر پاکستان کا موثر مؤقف اور قومی مفادات کے تحفظ کے لیے متوازن سفارت کاری اِس اعتماد کی علامت ہے جو ایک ذمہ دار اور باوقار ریاست کا امتیاز ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں ذرائع ابلاغ خصوصاً ریڈیو پاکستان قومی شعور کی آبیاری، مثبت فکر کے فروغ اور قومی ہم آہنگی کے استحکام میں اپنی ذمہ داریاں پوری دیانت اور وقار کے ساتھ نبھا رہا ہے۔ قومی تاریخ، تہذیب، ادب اور ثقافت کو نئی نسل تک مستند انداز میں منتقل کرنا ہمارا فرض ہی نہیں بلکہ ایک قومی امانت بھی ہے۔ ماہنامہ آہنگ کا یہ شمارہ اِنہی قومی، اخلاقی اور فکری اقدار کی ترجمانی کی ایک کاوش ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے وطن کو استحکام، امن، خوشحالی، ترقی، دیانت، صداقت اور خدمت کے جذبے سے سرشار رکھے اور پاکستان کو عالمی برادری میں مزید عزت وقار اور کامیابی عطا فرمائے۔

آمین

سربراہِ اعلیٰ
اشفاق احمد خلیل

نگرانِ اعلیٰ
سعید احمد شیخ

نگران
مسرت شاہ رخ
عمران جاوید

مدیرِ اعلیٰ
افشاں نگار

مدیر
انیس الرحمٰن

کمپوزنگ
رابعہ شبیر احمد

گرافک ڈیزائننگ
عمران جوہر

قیمت: 500روپے

ماہنامہ آہنگ جولائی 2026ء

☆عزمِ نو۔۔۔

3 پاکستان اسلام آباد میں خواتین سے متعلق او آئی سی (OIC) کانفرنس
رپورٹ: غضنفر عزیز

4 ریڈیو پاکستان بہاولپور کی چاردیواری مکمل — رپورٹ: فیض رسول ہاشمی

☆مضامین۔۔۔۔

5 مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح — ادارہ

7 یومِ شہادت کیپٹن سرور شہید — آہنگ ڈیسک
یومِ شہادت حوالدار لالک جان شہید
یومِ شہادت کیپٹن کرنل شیر خان شہید

8 یومِ شہدائے کشمیر — تحریر: ناصر علی خان

9 ملتان کی موسیقی — شاکر حسین شاکر

10 افغان شتربان آسٹریلیا میں — دُر محمد کاسی

12 قلعہ سیالکوٹ، قدیم تاریخ سے موجودہ دورتک مکمل جائزہ — فوزیہ طاہرہ

☆دانش ور۔۔۔۔

13 خاطر غزنوی کی شخصیت اور ادبی خدمات — تحریر: ڈاکٹر تاج الدین تاجور

☆ سخن ور۔۔۔۔

14 نئی نظم میں ظہور نظر کی آواز — تحریر: علی تنہا

☆فن اور فنکار۔۔۔۔

17 اُستاد اُمید علی خان — پرویز اختر

18 اُستاد نزاکت علی خان، جُگل بندی سے شہرت کمانے والے نامور گویے — محمد سعید احمد شیخ

19 اُستاد سلامت علی خان، شام چوراسی کا پنج پٹیہ گویا — محمد سعید احمد شیخ

20 تھرپارکر کے جگمگ ستارے — تحریر: خالد چانڈیو

☆اُردو ادب۔۔۔۔

23 مہمان (انشائیہ) — شازیہ نورین

25 جواب کے سوال (افسانہ) — علی تنہا

27 پاکستان میں اُردو خاکہ نگاری کی منزلیں — تحریر: محمد رمضان

☆ہم تو آواز ہیں۔۔۔۔

31 عبدالستار ایدھی، مجسم انسانیت (فیچر) — پرویز اختر

☆پوڈ کاسٹ۔۔۔۔

34 وزیراعلیٰ پنجاب کے مشیر برائے مصنوعی ذہانت جناب علی مصطفیٰ ڈار سے خصوصی گفتگو پر مبنی رپورٹ — رپورٹ: صدف رانی

☆تہذیب و ثقافت۔۔۔۔

35 کوٹ ڈیجی قلعہ — سلیم رضا شیخ

36 اتنڑ، گردشِ قدم میں زندہ تہذیب — شاہد اللہ خان

38 پشتو بھولے بسرے نغمے اور ریکارڈنگ کمپنیاں — محمد اسلم خان

☆اسپورٹس۔۔۔۔

39 قمر احمد، نامور کرکٹ صحافی کی رحلت — انیس الرحمن

☆بچوں کا آہنگ۔۔۔۔

40 میٹھے بول — مرزا ادیب

پاکستان میں خواتین سے متعلق او آئی سی کانفرنس کا انعقاد

رپورٹ : غضنفر عزیز

خواتین کو سیاسی، سفارتی، اقتصادی، معاشرتی اور معاشی طور پر بااختیار بنانے کے حوالے سے دو روزہ نویں او آئی سی وزارتی کانفرنس برائے خواتین اسلام آباد میں ہوئی۔ کانفرنس میں وفاقی وزیرِ قانون انصاف اور انسانی حقوق جناب اعظم نذیر تارڑ نے آئندہ دو سال کے لئے صدارت سنبھالتے ہوئے کہا کہ پاکستان اِس صدارت کو ایک ایسی ذمہ داری سمجھتا ہے جو پوری اسلامی دنیا میں خواتین کی زندگیوں کو بہتر بنانے کے لیے مشترکہ خواہشات کو عملی اقدامات میں تبدیل کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ وزیرِ انسانی حقوق نے کہا کہ پاکستان تجربات کے تبادلے، عملی تعاون کی حوصلہ افزائی اور خواتین کو بااثر بنانے کے مشترکہ عزم کو آگے بڑھائے گا۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ پاکستان خواتین کے حقوق، مواقع اور قیادت کو آگے بڑھانے کے لیے اپنی قانونی پالیسی اور ادارہ جاتی فریم ورک کو مسلسل مضبوط بنا رہا ہے اور ہم خواتین کی قیادت، مالیاتی شعبے میں اُن کی شمولیت اور کاروبار کو وسعت دے رہے ہیں، ڈیجیٹل تفریق کو ختم کر رہے ہیں، انصاف تک رسائی کو آسان بنا رہے ہیں اور کام کے مقامات پر محفوظ و مزید سازگار ماحول پیدا کر رہے ہیں۔ جناب اعظم نذیر تارڑ نے کہا کہ ہماری اجتماعی کوشش ہے کہ کوئی بھی عورت یا لڑکی تنازعات، غُربت اور عدم مساوات کی وجہ سے پیچھے نہ رہے۔ اِس موقع پر اپنے خطاب میں او آئی سی کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل برائے انسانی ثقافتی اور سماجی امور جناب طارق علی بخت نے ایسے اجتماعی اور ٹھوس اقدامات کی ضرورت پر زور دیا جو او آئی سی کے رُکن ممالک میں خواتین اور لڑکیوں کی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔

کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے نائب وزیر اعظم جناب محمد اسحاق ڈار نے کہا کہ پاکستان لڑکیوں کی تعلیم، کاروبار، ڈیجیٹل خواندگی اور اُن کی خود مختاری میں سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ جناب محمد اسحاق ڈار نے کہا کہ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ دونوں کے ذریعے خواتین کے وقار کو بلند کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ پاکستان کا آئین زندگی کے ہر شعبے میں خواتین کی مکمل شرکت کی ضمانت دیتا ہے اور اسے یقینی بناتا ہے۔ اُنہوں نے بھارت کے غیر قانونی زیرِ قبضہ جموں و کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان اُن خواتین کے مصائب سے بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا جو انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کو برداشت کر رہی ہیں۔ اُنہوں نے افغانستان کی عبوری رجیم پر بھی زور دیا کہ وہ خواتین اور لڑکیوں کے بنیادی حقوق بحال کرے۔

اپنی تقریر میں چیئرمین سینٹ جناب سید یوسف رضا گیلانی نے او آئی سی کے رُکن ممالک پر زور دیا کہ وہ خواتین کی معاشی خود مختاری کے لیے اپنے وعدوں کو ٹھوس اقدامات میں تبدیل کریں۔ اُنہوں نے تعلیم، گورننس، کاروبار، سائنس، سفارت کاری اور عوامی خدمات کے شعبوں میں مسلم خواتین کے کردار اور خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اُنہوں نے او آئی سی کے رُکن ممالک پر زور دیا کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ، قیادت میں خواتین کی شرکت بڑھانے، مالیاتی شعبے میں اُن کی شمولیت کو فروغ دینے اور ڈیجیٹل مہارتوں اور کاروبار میں سرمایہ کاری کے لیے مقرر کریں۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ٹیلی مواصلات کی وزیر محترمہ شزا فاطمہ خواجہ نے کانفرنس سے خطاب میں کہا کہ پاکستان او آئی سی کے رُکن ممالک کے ساتھ ایسی شراکت داری کے لیے تیار ہے جس کے ذریعے خواتین کو ڈیجیٹل طور پر بااختیار بنانے کے لیے آزمائشی منصوبوں اور ٹھوس اقدامات پر کام کیا جاسکے۔ اُنہوں نے کہا کہ پاکستان خواتین کو ڈیجیٹل اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبوں میں بااختیار بنانے کے لیے اپنے تجربات کے تبادلے، ایک دوسرے سے سیکھنے اور او آئی سی کے تمام رُکن ممالک سے جدید ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے لیے بھی تیار ہے۔ محترمہ شزا فاطمہ خواجہ نے کہا کہ پاکستان ہر بچی کو انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل رابطے کی سہولت کی فراہمی، محفوظ ڈیجیٹل شناخت اور اپنے مالیاتی اکاؤنٹ تک رسائی اور اس پر مکمل اختیار حاصل کرنے کی سمت میں آگے بڑھ رہا ہے۔

وزیر اعلیٰ پنجاب محترمہ مریم نواز شریف نے اسلام آباد میں خواتین سے متعلق اسلامی تعاون تنظیم او آئی سی کی نویں وزارتی کانفرنس کی اختتامی نشست سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خواتین کو بااختیار بنانا پائیدار ترقی کی بنیاد ہے۔ اُنہوں نے مسلم دنیا پر زور دیا کہ وہ اِس امر کو یقینی بنانے کے لیے مل کر کام کریں کہ ہر لڑکی کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ملے، ہر خاتون کو برابر کے مواقع میسر ہوں اور ہر ماں اور بیٹی عزت، سلامتی اور اُمید کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ اُنہوں نے کانفرنس کے شرکاء کو پاکستان کے عظیم ثقافتی ورثے، روایات اور مہمان نوازی کا مشاہدہ کرنے کے لیے پنجاب کا دورہ کرنے کی دعوت بھی دی۔

اختتامی نشست کے بعد ایک نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے وزیرِ قانون و انصاف اور انسانی حقوق جناب اعظم نذیر تارڑ نے کہا کہ حکومت خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے تمام دستیاب وسائل کو بروئے کار لانے کے لیے پُرعزم ہے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ آئندہ دو سالوں کے لیے خواتین کے حوالے سے او آئی سی کی وزارتی کانفرنس کی صدارت سنبھالنا پاکستان کے لئے ایک اعزاز کی بات ہے۔ جناب اعظم نذیر تارڑ نے کہا کہ اِس سربراہی اجلاس کے دوران او آئی سی کے رُکن ممالک نے اجتماعی طور پر اسلامی دنیا میں خواتین کو سماجی، سیاسی اور اقتصادی طور پر بااختیار بنانے کے اقدامات پر عمل درآمد کرنے کے لیے اپنے عزم کا اعادہ کیا۔ وفاقی وزیرِ قانون و انصاف اور انسانی حقوق نے کہا کہ شریک ممالک نے خواتین کو جدید ایجادات تک زیادہ سے زیادہ رسائی دینے کے عزم کا اظہار کیا جس کا مقصد اُنہیں اپنے اپنے ممالک کی بہتر خدمت کرنے کے قابل بنانا ہے۔

اِس موقع پر خطاب کرتے ہوئے او آئی سی کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل سفیر جناب طارق علی نے اپنے پُختہ یقین کا اظہار کیا اور کہا کہ پاکستان خواتین کو بااختیار بنانے کے شعبوں میں مزید کامیابیاں حاصل کرے گا۔

بشکریہ نیوز اینڈ کرنٹ افیئرز چینل

ریڈیو پاکستان بہاول پور کی چاردیواری مکمل

رپورٹ :از: فیض ہاشمی

کسی بھی ادارے کی مضبوط، محفوظ اور خوبصورت چاردیواری نہ صرف اس کی شناخت اور وقار کی علامت ہوتی ہے بلکہ ادارے کے تحفظ، استحکام اور بہتر انتظامی ماحول کی بھی ضامن ہوتی ہے۔ حکومتِ پاکستان، وزیرِ اعظم جناب میاں محمد شہباز شریف کی قیادت میں قومی اداروں کے انفراسٹرکچر کی بہتری، بحالی اور استحکام کے لیے مسلسل ترقیاتی منصوبوں پر عمل پیرا ہے، جن کے مثبت نتائج ملک بھر میں نمایاں ہو رہے ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی کے طور پر وفاقی وزیر برائے اطلاعات و نشریات جناب عطاء اللہ تارڑ کی خصوصی ہدایت پر ریڈیو پاکستان بہاولپور کی خستہ حال اور منہدم شدہ چاردیواری کی تعمیرِ نو کے منصوبے کا آغاز کیا گیا۔ اِس منصوبے کا سنگِ بنیاد رکن قومی اسمبلی ملک محمد اقبال چنڑ نے رکھا، جبکہ تقریب میں ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سعید احمد شیخ، بہاولپور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر جناب سید ظفر شریف، اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان بہاولپور جناب سجاد احمد بری، ڈپٹی کنٹرولر ریڈیو ہیڈ کوارٹرز اسلام آباد جناب عمران جاوید، تاجر رہنما جناب حاجی محمد اعجاز، جناب عبدالوحید نوناری اور دیگر معزز شخصیات نے شرکت کی۔

ریڈیو پاکستان بہاولپور، جس نے 18 اگست 2025ء کو اپنے قیام کے پچاس برس مکمل کیے، اپنی گولڈن جوبلی تقریبات کے دوران اِس اہم ترقیاتی منصوبے کی تکمیل کی جانب بھی کامیابی سے گامزن رہا۔ چاردیواری کی تعمیر کا باقاعدہ آغاز 24 مارچ 2026، بروز منگل، دوپہر 2 بجے کیا گیا اور تین ماہ میں یہ منصوبہ کامیابی کے ساتھ مکمل کر لیا گیا۔ منصوبے کی تکمیل کے دوران اسٹیشن ڈائریکٹر سجاد احمد بری، پروگرام منیجر محمد عاشق عباسی، انجینئرنگ منیجر زاہد علی، اکاؤنٹس آفیسر محمد شاہ نواز، ایڈمن انچارج محمد تنویر اور دیگر منتظمین نے تعمیراتی کام کی مسلسل نگرانی کی جبکہ منصوبے کی پیش رفت سے ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سعید احمد شیخ کو ہر ہفتے باقاعدگی سے آگاہ کیا جاتا رہا تاکہ تعمیراتی معیار اور رفتار کو یقینی بنایا جاسکے۔ نئی چاردیواری کی تکمیل سے ریڈیو پاکستان بہاولپور کی سیکیورٹی، خوب صورتی، انتظامی ماحول اور مجموعی انفراسٹرکچر میں نمایاں بہتری آئی ہے۔ اِس منصوبے نے نہ صرف ادارے کے وقار میں اضافہ کیا ہے بلکہ شہر کے حُسن میں بھی مثبت اضافہ کیا ہے۔

ریڈیو پاکستان بہاولپور سے وابستہ فنکاروں، کمپیئرز، ادبا، دانشوروں، سامعین اور سول سوسائٹی کے نمائندوں نے اِس اہم منصوبے کی کامیاب تکمیل پر وزیر برائے اطلاعات و نشریات جناب عطاء اللہ تارڑ، رکن قومی اسمبلی جناب ملک محمد اقبال چنڑ، ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سعید احمد شیخ اور منصوبے کی تکمیل میں کردار ادا کرنے والے تمام افسران و متعلقہ حکام کا شکریہ ادا کیا۔ اُنہوں نے اِس اُمید کا اظہار کیا کہ مستقبل میں بھی قومی اداروں کی ترقی، بحالی اور استحکام کے لیے اسی جذبے کے ساتھ عملی اقدامات جاری رہیں گے تاکہ ریڈیو پاکستان بہاولپور خطے کی علمی، ادبی، ثقافتی، زرعی اور سماجی خدمت کا اپنا تاریخی نشریاتی سفر مزید مؤثر انداز میں جاری رکھ سکے۔

بشکریہ ریڈیو پاکستان بہاولپور

مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح

ادارہ

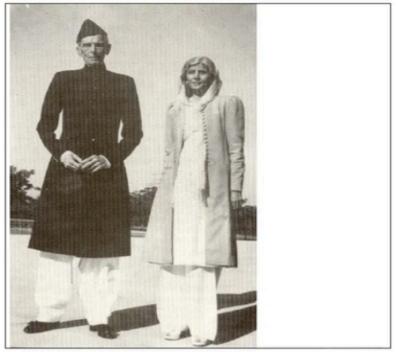

تحریکِ پاکستان کی داستان مردوں کی جراُتوں اور عورتوں کی قربانیوں سے لبریز ہے۔یوں تو آزادی کی لگن سے ہر دل سرشار تھا مگر جو کردار فاطمہ جناحؒ نے ادا کیا وہ قابلِ ستائش اور قابلِ تحسین ہے۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ نے قائداعظمؒ کے ساتھ طویل رفاقت میں محبت، خلوص، نگرانی، تیمارداری، خانہ داری اور مشاورت کا حق ادا کر دیا۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ 31 جولائی 1893ء میں اُس وقت پیدا ہوئیں جب قائداعظمؒ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان میں مقیم تھے۔وہ ابھی دو برس کی تھیں کہ والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ قائداعظمؒ کو اُن سے دِلی محبت تھی۔بہن بھائیوں کے درمیان محبت کی یہ داستان ہمیشہ زندہ رہے گی۔ سات برس کی عمر میں اُنہیں انگریزی اسکول میں داخل کرادیا گیا اور غالباً وہ پہلی مسلمان لڑکی تھیں جنہیں اُس اسکول میں داخلہ مل گیا۔ 1919ء میں فاطمہ جناحؒ کے دل میں کالج میں داخلہ لینے کا خیال پیدا ہوا۔ قائداعظمؒ نے سوچ بچار کے بعد انہیں ڈاکٹر احمد ڈینٹل کالج کلکتہ میں داخل کروادیا۔ یہ ہندوستان بھر میں دندان سازی کا واحد ادارہ تھا۔آپ نے 1922 میں دندان سازی کی تربیت حاصل کرلی اور بمبئ منتقل ہو گئیں۔

ایک طویل عرصہ تک قائداعظمؒ کے ساتھ رہنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ قائداعظمؒ کی شخصیت کے نقش اُن پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم ہو گئے۔ حُسنِ ذوق، اندازِ گفتگو، پسند و ناپسند، عادات و اطوار، رہن سہن اور وضع قطع عرض زندگی کے ہر شعبے میں وہ اپنے بھائی کے انداز سے متاثر ہوئیں۔اُنہوں نے بھائی کی رفاقت کا اِس حد تک خیال رکھا کہ اُن کی سیاسی مصروفیات کی بناء پر اُن کے گھر کی نگہداشت ایک خاص نظم و ضبط سے کی۔وہ کھانے سے لے کر صحت تک اُن کا خیال رکھتی تھیں۔

فاطمہ جناحؒ کی سیاسی سرگرمیوں کا منبع قائداعظمؒ کے سیاسی افکار تھے۔فاطمہ جناحؒ نے خلوصِ دل سے قائداعظمؒ کے خیالات اور نظریات کی ترویج کی جدوجہد کی۔اُنہیں اپنے بھائی کی صحت کا علم تھا۔سیاست میں اُنہوں نے محض اِس لئے انتھک محنت کی کہ بھائی کے کٹھن کام میں کچھ سہولت پیدا کرسکیں۔ قائداعظمؒ لندن سے واپس بمبئ آئے تو فاطمہ اُن کے ہمراہ تھیں۔اِسی سال قائداعظمؒ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ قائداعظمؒ کی ذمہ داریاں بڑھنے کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے سیاسی میدان میں ایک اہم ذمہ داری اپنے لئے مخصوص کرلی یعنی ہندوستان کی مسلم خواتین کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی ذمہ داری۔

قائداعظمؒ فرماتے تھے کہ جس قوم کی نصف آبادی عضوِ معطل بن جائے وہ کیسے عظمت حاصل کرسکتی ہے۔ لیکن فاطمہ نے اِس نصف خوابیدہ آبادی کو بیدار کرنے کا بیڑہ اُٹھایا اور خواتین کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے لئے کام شروع کردیا جس کو قائداعظمؒ نے اِن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

"فاطمہ میرے سیاسی کاموں میں نہ صرف ایک انتھک ساتھی ہے بلکہ میں بعض اوقات اُس کے مشوروں سے بھی مستفید ہوتا ہوں"۔

قائداعظمؒ فاطمہ جناحؒ کی سیاسی بصیرت پر کس قدر اعتماد کرتے تھے۔اِس کا ثبوت بیگم رافعہ شریف پیرزادہ کے اِس بیان سے ملتا ہے:

"جب قائداعظمؒ کے سیکریٹری کوئی مسودہ لاتے اور قائداعظمؒ کے سامنے رکھتے تو قائداعظمؒ فرماتے 'یہ مسودہ فل کونسل کے سامنے پیش کریں۔"

اِس طرح وہ عام طور پر اپنے بیانات بھی فاطمہ کو پڑھائے بغیر جاری نہیں کیا کرتے تھے۔بیگم جی اے خان اِس حقیقت کی گواہ ہیں کہ قائداعظمؒ خود کہا کرتے تھے "میں ہر اہم بیان جاری کرنے سے قبل اسے جنرل کونسل یعنی فاطمہ کو دکھا لیا کرتا ہوں۔فاطمہ میری بہترین مشیر بھی ہیں اور دوست بھی۔ فاطمہ جناحؒ نے ایک جگہ خود لکھا کہ مستقبل کے ہندو مسلم کے بارے میں سوچ سوچ کر جب قائداعظمؒ پریشان ہو جاتے تھے تو اِس عالم میں فاطمہ اُن کی ذہنی کشمکش سے نجات کا باعث بنتی۔

قائداعظمؒ نے ایک مرتبہ خود کہا کہ "مایوسی کے اِس دور میں میری بہن میرے لئے اُمید کی کرن اور مستقبل کی روشنی بن جاتی تھی۔ میں پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا اور میری صحت خراب تھی لیکن فاطمہ کے تدبر، توجہ اور حُسن انتظام سے میری تمام پریشانیاں دور ہو جایا کرتی تھیں۔"

مشہور کشمیری رہنما چوہدری غلام عباس نے فاطمہ جناحؒ کو قائداعظمؒ کا دستِ راست قرار دیا۔ 1937ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا لکھنؤ میں اہم اجلاس ہوا تو محترمہ فاطمہ جناحؒ نے شرکت کی۔ 1931ء میں وہ بمبئ کی صوبائی شاخ کی رُکن بنیں۔دسمبر 1938ء میں قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان میں خواتین کو مثبت کردار ادا کرنے کا موقع دیا اور پٹنہ میں مسلم لیگ کا اجلاس بلایا۔وہیں آل انڈیا مسلم لیگ خواتین کی کمیٹی کی بنیاد رکھی۔اِس کمیٹی میں فاطمہ بھی شریک تھیں جس کی وجہ سے خواتین میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا ہو گیا۔اِس طرح فاطمہ جناحؒ نے ہزاروں اجتماعات سے خطاب کیا اور قائداعظمؒ کے نصب العین کو خواتین کے سامنے مؤثر انداز میں پیش کیا۔اِن لمحات میں فاطمہ سے بہتر قائداعظمؒ کے خیالات و نظریات کی عکاسی کرنے والا اور کون ہو سکتا تھا۔

فاطمہ جناحؒ کے جلسوں میں بے پناہ ہجوم ہوتا۔اُن کی خدمت میں عقیدت کے پھول پیش کر کے خواتین کو احساس ہوتا جیسے وہ قائداعظمؒ کو پھول پیش کر رہی ہیں۔ 1943ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دہلی میں قائداعظمؒ کی صدارت میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ خواتین کو کلِ ہند بنیاد پر نمائندگی دلائی جائے۔اِس تجویز کی بناء پر تمام صوبوں سے نمائندہ خواتین کی نامزدگی کی گئی۔نامزد خواتین میں بیگم محمد علی جوہر، بیگم ہارون، بیگم بشیر احمد، بیگم تصدق حسین کے ساتھ ساتھ فاطمہ جناحؒ کو بھی ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔

1947ء میں پاکستان وجود میں آیا تو قائداعظمؒ نے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے ایک تقریر کے آخر میں ارشاد فرمایا:

"مس فاطمہ جناحؒ نے برابر میری امداد اور حوصلہ افزائی کی ہے۔اُن دنوں جب یہ خیال کیا جارہا تھا کہ برطانوی حکومت مجھے گرفتار کرلے گی، میری بہن ہی نے میرا حوصلہ بڑھایا۔اور جب میں حالات سے مایوس ہوتا جارہا تھا تو اُنہوں نے میرے دل میں اُمید کی شمع روشن کی۔وہ میری صحت کے بارے میں خصوصاً بڑی فکرمند رہتی ہیں۔"

1948ء میں جب قائداعظمؒ خرابیٔ صحت کی وجہ سے زیارت میں تشریف فرما تھے تو ایک اے ڈی سی لیفٹیننٹ مظہر احمد بھی فاطمہ جناحؒ کے ساتھ ساتھ قائد کے ساتھ رہے۔وہ لکھتے ہیں:

"فاطمہ جناحؒ جو برسوں سے اپنے بھائی کی واحد غمگسار اور رفیق کار تھیں۔ جس طرح اُس بیماری میں اُن کی خدمت اور تیمارداری کر رہی تھیں، وہ ایک بہن ہی کا حصہ ہے۔اکثر یوں ہوتا کہ وہ قائداعظمؒ کی دیکھ بھال میں یا اُن سے باتیں کرتے ہوئے اور اُنہیں کچھ پڑھ کر سناتے ہوئے کئی کئی راتیں جاگ کر گزار دیتیں۔ قائد کو اپنی بہن سے جس قدر محبت تھی، بہن نے بھی اُس کا حق ادا کر دیا۔"

محترمہ فاطمہ جناحؒ 8 جولائی 1967ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوئیں لیکن نوجوان نسل کے لئے اُن کا یہ پیغام مشعلِ راہ ہے:

"پاکستان کے نوجوانو! تمہاری رگوں کا خون سرد نہ ہونے پائے۔ قدرت نے تمہارے دامن میں رحمتوں کے خزانے بھر دیئے ہیں۔اُن کو کام میں لانا اور فائدہ اٹھانا تمہارا کام ہے۔ تمہارے ہاتھوں میں بہت جلد مستقبل کی عنان آنے والی ہے۔اپنا راستہ، اپنی منزل اور اپنی ذمہ داریوں کا تمہیں ابھی سے اندازہ کرنا ہو گا اور اِس کا انحصار تم پر ہو گا کہ کس قدر تیزی کے ساتھ تم خود کو ایک مستحکم اور عظیم تر قوم میں تبدیل کرو گے۔"

مادرِ ملت کا کردار پاکستان کی خواتین کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ صرف اِس کو سمجھنے اور اپنانے کی ضرورت ہے۔فاطمہ جناحؒ نہ صرف اچھی بہن بلکہ قوم کی رہنما بھی تھیں۔

اے مادرِ ملت
اے مادرِ ملت
اے مادرِ ملت، اے مادرِ ملت
تشکیلِ وطن میں وہ ترا جذبۂ خدمت
جذبے کا وہ اخلاص، عمل کی وہ صداقت
ہے نقش دلوں پر ترے کردار کی عظمت
اے مادرِ ملت
اے مادرِ ملت
تو قائداعظم کی طرح قوم کی محسن
تاریخ میں محفوظ ہیں وہ گزرے ہوئے دن
جب ایک بہن دل سے تھی بھائی کی معاون
اے مادرِ ملت
اے مادرِ ملت
ہیں طبقہ نسواں پہ بھی کیا کیا ترے احسان
ہر کام میں بہبود کا پہلو ہے نمایاں
تحریک میں عورت کے بھی جوہر ہیں درخشاں
وہ بھی رہی سرگرم ترے زیرِ ہدایت
اے مادرِ ملت
اے مادرِ ملت
صدیوں کی غلامی سے جو آزاد ہوئے ہم
غیرت سے جو لکھی ہوئی روداد ہوئے ہم
اِک خطہ عزت میں جو آباد ہوئے ہم
اِس میں ترے بے لوث عمل کی بھی ہے برکت
اے مادرِ ملت
اے مادرِ ملت

آہنگ 1990ء

کیپٹن راجہ محمد سرور شہید

کیپٹن راجہ محمد سرور شہید تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی کے ایک گاؤں سنگھوڑی میں 10 نومبر 1910ء میں ایک گجر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام راجہ محمد حیات خان تھا۔ پہلا نشانِ حیدر پانے والے کیپٹن راجہ محمد سرور شہید نے اپنی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ زمیندرہ اسلامیہ ہائی اسکول دسوہہ، فیصل آباد سے حاصل کی۔ 1929ء میں اُنہوں نے فوج میں بطور سپاہی شمولیت اختیار کی۔ 1944ء میں پنجاب رجمنٹ میں کمیشن حاصل کیا جس کے بعد اُنہوں نے برطانیہ کی جانب سے دوسری عالمی جنگ میں حصہ لیا۔ شاندار فوجی خدمات کے پیشِ نظر 1946ء میں اُنہیں مستقل طور پر کیپٹن کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد سرور شہید نے پاک فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ 1948ء میں جب وہ پنجاب رجمنٹ کی سیکنڈ بٹالین میں کمپنی کمانڈر کے عہدے پر خدمات انجام دے رہے تھے، اُنہیں کشمیر میں آپریشن پر مامور کیا گیا۔ 27 جولائی 1948ء کو اُنہوں نے کشمیر کے اوڑی سیکٹر میں دشمن کی اہم فوجی پوزیشن پر حملہ کیا۔ اُس حملے میں مجاہدین کی ایک بڑی تعداد شہید اور زخمی ہوئی لیکن کیپٹن سرور نے پیش قدمی جاری رکھی اور دشمن کو ناقابل فراموش شکست سے دوچار کیا۔ اُن کی شاندار خدمات کے اعتراف میں جہاں اُنہیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا، وہیں 27 اکتوبر 1959ء کو انہیں نشانِ حیدر کے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا گیا۔ انہیں پہلا نشانِ حیدر پانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ یہ اعزاز اُن کی بیوہ محترمہ کرم جان نے 3 جنوری 1961ء کو صدرِ پاکستان محمد ایوب خان کے ہاتھوں وصول کیا تھا۔

حوالدار لالک جان شہید

والدار لالک جان شہید 1967ء میں آبائی گاؤں غذر یاسین گلگت میں پیدا ہوئے۔ وادی غذر جسے وادئ شہداء بھی کہا جاتا ہے، لالک جان 12 این ایل آئی کے ایک بے باک نڈر اور بہادر سپاہی کے طور پر اُبھر کر سامنے آئے۔

مئی 1999ء میں حوالدار لالک جان نے اگلے مورچوں پر لڑائی لڑنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اور ایک انتہائی مشکل اور دشوار گزار پہاڑی چوکی پر دشمن سے نبرد آزما ہونے کیلئے کمر باندھ لی، قادر پوسٹ آج بھی نازاں ہے کہ اسے لالک جان جیسانڈر محافظِ ملا۔

12 جون 1999ء کو لالک جان نے دشمن کی پیٹرول پر اچانک ایسا زبردست حملہ کیا کہ دشمن اپنی لاشیں چھوڑ کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ جون 1999ء کے آخری ہفتے میں ایک رات کو دشمن کی بھاری نفری نے حوالدار لالک جان کی چوکی پر حملہ کیا۔ حملے کے دوران حوالدار لالک جان اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر مختلف پوزیشنوں سے دشمن پر فائر کرتے رہے اور ہر مورچے میں جا کر جوانوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ رات بھر جاری رہنے والے حملے کو لالک جان اور اُن کے ساتھیوں نے ناکام بنادیا اور صبح نامراد دشمن لاشوں کے انبار چھوڑ کر پسپا ہو گیا۔ حملے کی دوسری رات مزید کمک حاصل کرنے کے بعد دشمن نے ایک بار پھر مختلف اطراف سے حملہ کیا لیکن حوالدار لالک جان اینڈ کمپنی نے اُس رات بھی بے باکی اور جرأت مندی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے یہ حملہ بھی ناکام بنادیا اور دشمن کو بھاری جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔

7 جولائی کو حوالدار لالک جان دشمن کے توپ خانے کے بھاری فائر اور تین اطراف سے حملے کے دوران شدید زخمی ہوگئے۔ کمپنی کمانڈر نے انہیں پیچھے جا کر علاج کرانے کا کہا مگر لالک جان نے کہا کہ میں کسی اسپتال کے بستر کے بجائے میدانِ جنگ میں جان دینے کو ترجیح دوں گا۔ اُنہوں نے زخمی حالت میں بھی بھاری فائر کے دوران دشمن کے بنکر میں بارود پھینک کر اسے ایمونیشن سمیت تباہ کر دیا جس سے دشمن کے درجنوں فوجی ہلاک ہو گئے۔

دوسری سمت سے دشمن کے فائر کی زد میں آکر بالآخر لالک جان نے اپنی جان، جانِ آفرین کے سپرد کی اور جامِ شہادت نوش کر کے امر ہو گئے۔ اُن کی بے مثال جرأت اور لازوال قربانی کے اعتراف میں انہیں نشانِ حیدر کا اعزاز عطا کیا گیا۔ قادر پوسٹ کے زبردست دِفاع کا اعتراف دشمن نے بھی کیا۔ کسی بھی سپاہی نے اپنی پوسٹ نہ چھوڑی، یہ دِفاعی جنگ بہادری کی اعلیٰ مثال ہے کہ جو آخری سپاہی اور آخری گولی تک لڑی گئی۔

کیپٹن کرنل شیر خان شہید

کیپٹن کرنل شیر خان شہید 1 جنوری 1970ء میں نواں کلی، ضلع صوابی، خیبر پختونخواہ میں پیدا ہوئے۔ کیپٹن کرنل شیر خان شہید پاکستان آرمی کے وہ بہادر سپوت تھے جنہوں نے کارگل معرکے میں بے مثال شجاعت، عزم اور قربانی کی ایسی مثال قائم کی جو عسکری تاریخ کا روشن باب بن چکی ہے۔

شدید دشمنانہ حملوں کے باوجود اُنہوں نے اپنے ساتھیوں کی قیادت کرتے ہوئے متعدد بار جوابی کارروائیاں کیں اور آخری سانس تک وطن کے دفاع کا فریضہ انجام دیا۔ اُن کی غیر معمولی بہادری کا اعتراف دشمن فوج نے بھی کیا جو اُن کے بلند کردار اور عسکری عظمت کا واضح ثبوت ہے۔

اُنہوں نے 5 جولائی 1999ء کو کارگل کے محاذ پر جامِ شہادت نوش فرمایا۔ مادرِ وطن کے لیے اُن کی بے مثال قربانی کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے اُنہیں ملک کے اعلیٰ ترین عسکری اعزاز نشانِ حیدر سے نوازا۔ کیپٹن کرنل شیر خان شہید کا نام ہمیشہ جرأت، وفاداری، حبُ الوطنی اور ایثار کی علامت کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

آہنگ ڈیسک

یومِ شہدائے کشمیر

عزم، قربانی اور حقِ خود ارادیت کی داستان

تحریر: ناصر علی خان

کشمیر کی وادی اپنی بے مثال خوبصورتی، بلند پہاڑوں، سرسبز میدانوں، بہتے چشموں اور دلکش مناظر کی وجہ سے دنیا بھر میں جنتِ نظیر خطے کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ لیکن اِس حسین وادی کی تاریخ قربانیوں، جدوجہد اور عزم و استقلال کی ایک ایسی داستان بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جسے اہلِ کشمیر نسل در نسل یاد رکھتے آئے ہیں۔ یومِ شہدائے کشمیر اِسی تاریخ کا ایک اہم باب ہے جو اُن افراد کی یاد میں منایا جاتا ہے جنہوں نے اپنے حقوق، شناخت اور مستقبل کے لیے قربانیاں دیں۔ تاریخ کے صفحات پر 13 جولائی 1931ء کا دن ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس روز سری نگر کی سینٹرل جیل کے باہر ایک احتجاجی اجتماع ہوا جہاں بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ اِس واقعے میں کئی افراد جان سے گئے۔ یہ دن کشمیری تاریخ میں ایک ایسے واقعے کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جس نے سیاسی شعور اور اجتماعی جدوجہد کے ایک نئے دور کو جنم دیا۔

شہادت کا تصور اسلامی اور انسانی تاریخ میں ہمیشہ عزت و احترام کی علامت رہا ہے۔ قرآنِ کریم میں شہداء کے بلند مقام کا ذکر موجود ہے، جبکہ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ اصولوں، انصاف اور وقار کے لیے دی جانے والی قربانیاں قوموں کے حوصلے مضبوط کرتی ہیں۔ یومِ شہدائے کشمیر بھی اسی جذبے کی یاد دہانی ہے۔ کشمیر کی تاریخ محض سیاسی واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہاں کے عوام کی ثقافت، تہذیب، زبان، ادب اور روایات سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ کشمیری معاشرہ صدیوں سے علم، تصوف، فنون اور ادب کا مرکز رہا ہے۔ ادب اور صحافت نے بھی کشمیر کے حوالے سے عوامی شعور اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شاعروں نے اپنے اشعار میں وادئ کشمیر کی خوبصورتی، اہلِ کشمیر کے عزم اور امن کی خواہش کو بیان کیا، جبکہ ادیبوں اور صحافیوں نے تاریخ، تہذیب اور انسانی پہلوؤں کو قلم بند کر کے اِس موضوع کو زندہ رکھا۔ یہی ادبی سرمایہ آنے والی نسلوں کو اپنی تاریخ اور قومی شعور سے جوڑے رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اِسی لیے کشمیر کا مسئلہ صرف جغرافیہ نہیں بلکہ انسانی جذبات اور احساسات سے بھی وابستہ ہے۔ یومِ شہدائے کشمیر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ قوموں کی زندگی میں اتحاد، صبر اور حوصلہ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ تاریخ میں زندہ رہنے والی قومیں وہی ہوتی ہیں جو اپنے ماضی کو یاد رکھتے ہوئے مستقبل کی تعمیر پر توجہ دیتی ہیں۔ شہداء کی یاد محض ایک رسم نہیں بلکہ ایک عہد ہے کہ معاشرے میں امن، انصاف، انسانی وقار اور باہمی احترام کو فروغ دیا جائے۔ پاکستان میں بھی یومِ شہدائے کشمیر کو کشمیری عوام کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اِس موقع پر مختلف تقریبات منعقد کی جاتی ہیں جن میں شہداء کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے اور خطے میں امن و استحکام کی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے۔ پاکستان کا سرکاری مؤقف ہمیشہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور کشمیری عوام کے حقِ خودارادیت کے حوالے سے بیان کیا جاتا رہا ہے۔

ہر دور میں وہاں کے سیاسی، سماجی اور انسانی حالات نے نئی شکل اختیار کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ دنیا میں امن، مذاکرات اور سفارتی کوششوں کی اہمیت بڑھتی گئی۔ موجودہ دور میں بھی عالمی برادری اِس بات پر زور دیتی ہے کہ انسانی مسائل کا حل مکالمے، امن اور پُرامن ذرائع سے تلاش کیا جائے۔ کشمیر کی سرزمین نے صدیوں سے ایسے افراد کو جنم دیا ہے جنہوں نے علم، ادب، روحانیت اور تہذیب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری معاشرہ اپنی ثقافتی شناخت، روایات اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے باعث ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اِس سرزمین کے باسی اپنے رسم و رواج، زبان، دستکاری، موسیقی اور مہمان نوازی کے لیے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ یومِ شہدائے کشمیر اس تہذیبی ورثے کی حفاظت اور قومی تشخص کے احساس کو بھی تازہ کرتا ہے۔ پاکستان اور کشمیر کے درمیان مذہبی، ثقافتی، تاریخی اور جغرافیائی تعلقات ہمیشہ مضبوط رہے ہیں۔

اسلام ہمیں عدل، انصاف، صبر، استقامت اور انسانی جان کے احترام کا درس دیتا ہے۔ قرآنِ مجید میں شہداء کے بلند مقام کا ذکر موجود ہے اور مسلمانوں کو حق، انصاف اور اخلاقی اصولوں پر قائم رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اِسی تناظر میں شہداء کی یاد ہمیں اپنے کردار، اپنے قومی رویوں اور اجتماعی ذمہ داریوں کا بھی احساس دلاتی ہے۔ شہداء کی قربانیاں محض ماضی کا ایک باب نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک اخلاقی پیغام بھی ہیں کہ ہر حال میں سچائی، دیانت اور انصاف کا دامن تھامے رکھا جائے۔ یومِ شہدائے کشمیر نوجوان نسل کو بھی یہ پیغام دیتا ہے کہ وہ تعلیم، تحقیق، کردار سازی اور قومی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے۔ مضبوط قومیں صرف جذبے سے نہیں بلکہ علم، شعور، اتحاد، نظم و ضبط اور محنت سے ترقی کرتی ہیں۔ نوجوان اگر اپنے ماضی سے سبق حاصل کرتے ہوئے مستقبل کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کریں تو وہ کسی بھی قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔ عالمی سطح پر بھی انسانی حقوق، انصاف اور پائیدار امن کو بنیادی اقدار کی حیثیت حاصل ہے۔ اقوامِ عالم کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے تمام تنازعات کے حل کے لیے بین الاقوامی قوانین، سفارت کاری، باہمی احترام اور مذاکرات کے راستے کو فروغ دیں تاکہ خطے میں امن، استحکام اور خوشحالی کی فضا قائم ہو سکے۔ جنوبی ایشیا کا امن بھی باہمی اعتماد، تعمیری مکالمے اور پائیدار حل سے وابستہ ہے۔ یومِ شہدائے کشمیر ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ اختلافات اور تنازعات کا دیرپا حل طاقت کے بجائے انصاف، قانون، برداشت اور مکالمے میں پوشیدہ ہے۔ جب معاشرے میں انصاف، انسانی وقار اور بنیادی حقوق کو یقینی بنایا جاتا ہے تو امن اور ترقی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ یہی وہ اصول ہیں جن پر ایک مضبوط، مستحکم اور خوشحال معاشرے کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ آج کا دن اِس عہد کی تجدید کا دن بھی ہے کہ شہداء کی قربانیوں کو ہمیشہ احترام سے یاد رکھا جائے، کشمیری عوام کے ساتھ اخلاقی اور انسانی یکجہتی کا اظہار کیا جائے اور ہر سطح پر امن، بھائی چارے، باہمی احترام اور انصاف کے فروغ کے لیے کوششیں جاری رکھی جائیں۔ یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ قومیں اپنے محسنوں اور شہدا کو فراموش نہیں کرتیں بلکہ اُن کے ایثار کو اپنی اجتماعی یادداشت کا حصہ بناتی ہیں۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شہدائے کشمیر کے درجات بلند فرمائے، اُن کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا کرے، کشمیر سمیت پوری دنیا میں امن، انصاف اور استحکام نصیب فرمائے، پاکستان کو ترقی، اتحاد اور خوشحالی کی راہ پر گامزن رکھے اور ہمیں اپنے وطن اور انسانیت کی خدمت اخلاص، دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

شہداء کسی قوم کا وہ روشن سرمایہ ہوتے ہیں جن کی قربانیاں تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ عزت، وقار اور عزم کی علامت بن کر زندہ رہتی ہیں۔

بشکریہ FM-101 اسلام آباد

ملتان کی موسیقی

تحریر: شاکر حسین شاکر

ملتان کی ثقافتی زندگی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی ملتان کی تاریخ پرانی ہے۔ تاریخ کی کتابیں پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کی ملتان آمد کے موقع پر بہت سی سنگوں نے اُن کا استقبال کیا تھا۔ دریائے راوی کے کنارے جو اُن دنوں ملتان کے نواح میں بہتا تھا ایک قلعہ "سکر طلائی" کے نام سے معروف تھا۔ جیسا کہ طلائی سے پتہ لگتا ہے کہ اُس قلعے کا ایک لوہے کا دروازہ بھی تھا جس پر یقیناً سونے کا کام کر رکھا ہوگا۔ اِس کے علاوہ علاقے میں رقص و موسیقی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یقینی طور پر یہ وہ دور ہے جب یہاں مسلمان بہت کم ہوا کرتے تھے اور اِسی وجہ سے ہندوؤں کی موسیقی جو عبادت کا درجہ رکھتی تھی، ہر طرف سنائی دیتی تھی اور جب ہم مسلمانوں کے دور کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صرف تغلق بادشاہوں کے دور میں موسیقی کی محفلوں کا ذکر ملتا ہے اور یہ کوٹلہ تولے خاں میں سجائی جاتی تھیں جو اُس دور میں کوٹلہ تولے خاں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اُن محافل میں امیر خسرو، نائیک گوپال کمار نرمل جیسے عظیم فنکار شرکت کرتے تھے اور موسیقی کی محفلوں میں اکثر امیر خسرو کو برتری رہتی تھی۔ امیر خسرو ایک عرصہ تک ملتان میں رہائش پذیر رہے۔

1294ء میں جب علاؤالدین نے ڈھاکے پر حملہ کیا تو یہ وہ دور تھا جب یہاں موسیقی اعلیٰ درجے پر رائج تھی اور پھر 1310ء میں ملک کافور نے جنوبی ہند پر یلغار کی تو اُس علاقے کو آباد کرنے کے لئے دو چار نامور گلوکار ملتان سے بھیجے گئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تغلق، خلجی اور مغل دور میں ملتان میں موسیقی اپنے عروج پر تھی اور اِس شہرت کو دیکھتے ہوئے جہاندار شاہ نے رقاص نعمت خاں کو ملتان کا گورنر بھی مقرر کیا جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مغل بادشاہ کس انداز میں موسیقی سے تعلق رکھنے والوں کی عزت افزائی کیا کرتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یہاں موسیقی کا سیلاب اُمڈ آیا اور ملتان کی فضا نغمہ و آہنگ سے معمور ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آئے دن سنگیت محافل برپا ہوتی رہیں جن میں ملک کے ماہر موسیقار شرکت کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک 1932ء میں سورج کنڈ کے مندر میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اُس محفل کی سماعت افروز سرور بہت پُر کیف تھا۔ اُس وقت ملتان میں دیگر ماہرینِ فن کے علاوہ ہر دلعزیز اور ممتازِ زمانہ مسلمان گلوکار توکل حسین خاں بھی موجود تھے۔ توکل جیسا گویّا میں نے زندگی بھر نہیں سنا اور شاید ایک عرصے تک ایسا گلوکار پیدا نہ ہو سکے اور آج بھی بڑے بڑے فنکار اگر جسارت کریں کہ توکل خاں جیسی گائیکی پیش کریں تو شاید یہ لوگ اُس کی گرد تک نہ پہنچ سکیں۔ موٹی موٹی آنکھیں، بیٹھی ہوئی ناک، سانولے رنگ اور درمیانے قد کے اُس خراباتی مغنی آتش نفس کی آواز میں وہ جادو تھا کہ کوئلیں اُس آواز کی بازگشت کے گرد طواف کرتی تھیں۔ اُس کی مہین آواز آبادیوں میں گم ہو جاتی تھی۔ اُس لطیف آواز میں بلا کا لوچ تھا۔ وہ کلارنٹ کے ساتھ گاتے تھے اور بعض اوقات، تار استھان کے آخری سُر تک آواز کو بلند کر کے کلارنٹ کے ساتھ گاتے تھے اور بعض اوقات اُن کی آواز پر عورت کی آواز کا گمان ہونے لگتا تھا۔ فطرت کا یہ شاہکار گویّا موسیقی میں اپنے زمانے کا سنگِ میل تھا۔

خیال، ٹھمری، غزل اور کافی یکساں لطافت اور شگفتگی کے ساتھ پیش کرتا تھا اور سرگم میں دلکش انگریزی بینڈ بجاتا تھا۔ یہاں تک کہ انگریز بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

توکل خاں مخدوم محمد رضا شاہ گیلانی کے مرید تھے اِس لئے آکر مخدوم صاحب کی مجالس میں چہکتے رہتے تھے، مسلمانوں میں مرحوم موسیقی کے دلدادہ تھے اور اکثر سماع کی محفلوں میں ماہرینِ فن کو دعوت دیتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔ خود بھی کبھی کبھی موسیقی کا شوق فرماتے تھے۔ مخدوم صاحب سال بہ سال شیر شاہ اسٹیشن کے قریب مختار واں کے عُرس کے موقع پر بڑے بڑے نامور گلوکار بلاتے، محفلِ سماع قائم کرتے تھے۔ اُن میں توکل خاں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے جہاں تلیری باغ مظفر گڑھ کی کوئلیں صبح پانچ بجے کے قریب توکل خاں کی بلند اور فلک شگاف آواز کی بازگشت کے ساتھ گاتی تھیں۔ اُس سرور آگیں محفلوں کی یاد اب بھی دلوں کو گرماتی رہتی ہے۔

جب ملتان کے لے کاری کے فن کا بول بالا برصغیر پاک وہند میں ہوا تو 1918ء میں جالندھر جو کہ موسیقی کا گڑھ سمجھا جاتا ہے، کے لوگوں نے جالندھر سالانہ کلاسیکی موسیقی کانفرنس جو کہ ہیر میلے کے موقع پر منعقد کی جاتی تھی، میں شمولیت کے لئے میاں اللہ ڈوایا نقارچی کو دعوت۔ اُس محفل میں پاک وہند کے لے اور سُر کے عالم لوگ بڑی تعداد میں شامل تھے۔ اُس محفل میں جب میاں اللہ ڈوایا خاں صاحب کا نقارہ اسٹیج پر پہنچا تو تمام لوگوں میں لہر دوڑ گئی کہ ایسی نفیس محفل میں یہ عجیب اور بے ڈھب ساز محفل کو خاک محظوظ کرے گا لیکن اُس شخصیت نے ایسے نفیس اور ملائم انداز سے چوب استعمال کی کہ ہر بول کی شفافی سامعین پر گہرا اثر چھوڑتی چلی گئی اور لوگوں کا چین وسکون لُٹ گیا۔ اُن کے بعد جالندھر کے نقارچی خاندان کے نمائندوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی جرأت نہ کی اور نہ ہی سننے والوں نے اُن کی ضرورت محسوس کی۔ میاں اللہ ڈوایا خاں کے بعد اُن کے بھائی میاں فیض بخش اور اُن کے فرزند خورو میاں غلام محمد نے بھی اپنے آبائی فن کو جاری رکھا اور میاں فیض بخش کے صاحبزادے حسین بخش عرف حسو نے اِس فن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کتھا ناچ کی طرف زیادہ توجہ دی۔ آج کل وہ ڈانس ڈائریکٹر ہیں اور اِس خاندن کے ایک اور فرزند محمد رمضان عرف بانا نقارے کے فن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ میاں اللہ ڈوایا نقارچی سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوئے جن میں لالو خاں اور بلے خاں طبلچی کے والد خلیفہ رُحیم بخش شامل ہیں۔ پس یہی وہ خاندان ہے جس نے لے کاری کے فن کی وجہ سے اُس دور میں شاہی انعامات حاصل کئے۔

بشکریہ پی بی سی ملتان

افغان شتر بان آسٹریلیا میں

Afghan Camellers in Australia

تحریر و تحقیق:۔ڈُر محمد کاسی

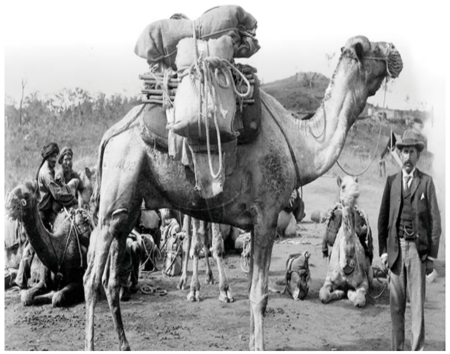

میں عرصے سے سوچ رہا تھا کہ وہ کون سے پشتون لوگ تھے جو پشتونخوا کی سرزمین سے اٹھارویں صدی میں سمندری جہازوں کے ذریعے اونٹوں کے قافلے لے کر آسٹریلیا پہنچے، اِس کی ضرورت کیوں پیش آئی اور وہ کس طرح وہاں پہنچے۔ اُن کی خبریں اور قصے تقریباً تمام بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ کسی نہ کسی طور پر جانتے تو تھے مگر اُن کی تفصیلات کسی کتاب یا مصدقہ دستاویز میں موجود نہیں تھیں۔ خوش قسمتی سے 2025ء میں مجھے سوشل میڈیا پر ایک آسٹریلیوی خاتون رپورٹر "ریتا جویان Rita Joyan" کی اُن شتر بانوں کی آسٹریلیا آمد اور زندگی کی تفصیلات پر مبنی سلسلہ وار رپورٹس ملیں۔

اِن کی تصدیق کے لیے میں نے گوگل اور ڈیپ سیک Google and Deep Seek سے بھی مصدقہ معلومات حاصل کیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ اُن پاوندہ قبائلی شتر بانوں کی جفاکشی محنت اور خلوص سے اِس وسیع براعظم میں پہلے پہل ترقی کی جانب قدم اُٹھائے گئے اور یہ شتر بان سمندری جہازوں میں نہ صرف اونٹ لے کر گئے بلکہ وہ اپنے ساتھ پہلی مرتبہ دینِ اسلام، مساجد اور خدائے واحد کی صدا "اللہ اکبر" بھی لے کر آسٹریلیا پہنچے۔ آج اُس براعظم میں دینِ اسلام، مساجد، کجھور، اونٹ، چکور پشتون اور افغان قوم کی دیگر علامات اِن ہی جفاکش شتر بانوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ یہ شتر بان کون تھے ! اِس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کوئٹہ، ژوب، پشین، لورالائی، وزیرستان، غزنی اور کندھار کے پشتون خانہ بدوش تھے جو صدیوں سے اپنے مال مویشیوں کے ساتھ افغانستان سے ہندوستان تک سفر کرتے تھے۔ وہ موسمِ سرما میں بالائی خطوں سے اونٹوں کے قافلوں میں سندھ، پنجاب اور ہندوستان کے گرم خطوں کی جانب آتے اور پھر موسم بہار میں واپس اپنی سرزمین کی جانب چلے جاتے۔ اِس سفر میں وہ تجارتی مال اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ بھی فروخت کرتے تھے۔ 1893ء میں ڈیورنڈ لائن کے بعد یہ تمام اضلاع برطانوی راج کا حصہ بنے لیکن چونکہ تاریخی طور پر یہ سرزمین افغانستان کا حصہ رہے تھے اور جب یہ شتر بان آسٹریلیا میں 1850ء کی دہائی میں بھجوائے گئے تو انہیں افغان شتر بان ہی کہا جاتا تھا حالانکہ اِن اکثریت کا تعلق برٹش بلوچستان اور وزیرستان سے تھا۔

اِس سلسلے میں، میں نے ایک دلچسپ کہانی کے ایک اہم کردار کو پہلی مرتبہ اُس وقت دیکھا جب میری عمر صرف 10 یا 12 سال کی تھی۔ میں اپنے مرحوم والد صاحب صوفی غلام محمد کاسی کے ساتھ قلعہ کاسی کوئٹہ کی جامع مسجد میں نماز پڑھنے گیا ہوا تھا وہاں پر ایک بزرگ شخص نے امام مسجد سے کہا کہ وہ 50 برس پہلے بحیثیت شتر بان آسٹریلیا گیا تھا اور اب واپس آیا ہوں۔ الحمد اللہ میں نے کوئی نماز قضاء نہیں کی مگر اُس بنجر اور گرم صحرا میں نہ تو ہمیں اسلامی کلینڈر کا اندازہ ہوتا اور نہ ہی افطار اور سحری کے اوقات کا، اور پھر ہم اکثر سفر اور محنت مشقت کرتے تھے۔ اِسی لیے میں نے برسوں تک روزہ نہیں رکھا۔ مولوی صاحب اب آپ فرمائیں کہ اِس کے ازالے کے لیے میں کیا کروں؟ مجھے یاد نہیں کہ مولوی صاحب نے اُنہیں کیا جواب دیا مگر اُس وقت سے میرے ذہن میں یہ تجسس رہا کہ یہ کون لوگ تھے اور آسٹریلیا کیوں اور کیسے پہنچے؟

آسٹریلیا کی تاریخ میں اِن افغان شتر بانوں کا کردار بہت دلچسپ اور بڑی اہمیت کا حامل رہا۔

1850ء کی دہائی کے آغاز میں آسٹریلیا کے وسیع اور بنجر ARID خطوں پر اِن ہی شتر بانوں نے بہت دیرپا اور پائیدار اثرات چھوڑے اور ان صحراؤں کی تسخیر، کھوج اور ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کیا۔ انیسوی صدی کے آغاز میں یورپی نو آباد کاروں نے آسٹریلیا پر قبضہ کیا اور پھر وہ اِس وسیع براعظم کا بغور جائزہ بھی لے رہے تھے اور دُور دراز کے خطوں اور صحرائوں کو تسخیر کر کے معدنی اور دیگر وسائل تک رسائی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے پاس صرف گدھے، گھوڑے اور خچر تھے مگر ان وسیع اور خشک خطوں کی تسخیر کے لیے یہ حیوانات موزوں نہیں تھے کیونکہ یہ حیوانات اُس مشکل اور خشک ماحول میں دُور دراز تک مہینوں کا سفر کرنے اور رسد پہنچانے کے قابل نہیں تھے البتہ اونٹ یہی کام آسانی سے کر سکتے تھے کیونکہ وہ صحرا کے جہاز ہیں وہ کم پانی میں بھی طویل سفر کر سکتے تھے اور بھاری وزن لے کر جا سکتے تھے۔ اِس طرح آسٹریلیا کے نئے آباد کار انگریزوں نے ہندوستان کے انگریز آباد کاروں کے مشورے اور مدد سے یہاں سے اونٹوں کی برآمد کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ پشتون خانہ بدوشوں کی صلاحیت سے خوب واقف تھے۔

تھامس ایلڈر (Thomas Elder) اور (Samual Stuckey) وہ دو (۲) پہلے انگریز تھے جنہوں نے برصغیر کے انگریزوں کی مدد سے پہلے پہل آسٹریلیا میں اونٹوں کی درآمد کا آغاز کیا۔ اِن شتر بانوں نے مناسب اور تندرست اونٹوں کا انتخاب کر کے انہیں کوئٹہ سے کراچی کی بندرگاہ تک پہنچایا۔ یہ 1866ء میں 124 اونٹوں اور 31 ماہر شتر بانوں کا قافلہ تھا جسے تین مہینوں کے مشکل بحری سفر کے بعد آسٹریلوی بندر Beltana پہنچایا گیا یوں یہ شہر اُن شتر بانوں کا سب سے پہلا اور اہم مرکز بنا اور پھر اُن لوگوں کی آمد کا سلسلہ کئی دہایوں تک جاری رہا۔ وہ پہلے پہل اُسی شہر میں خانہ بدوشانہ زندگی گزارنے لگے۔ یہ شہر آسٹریلیا کے جنوب میں واقع ہے یہ شتر بانوں کے لیے بنیادی اہمیت کا سال ہے جس سے اُنہوں نے اِس ملک میں پاؤں جمانے کا آغاز کیا۔ یہ اندازہ ہے کہ صرف 1860ء کی دہائی میں کوئٹہ کے راستے تقریباً 300 شتر بان آسٹریلیا پہنچے اور پھر یہ سلسلہ 1910ء تک جاری رہا۔ آسٹریلیا کی 1901ء کی مردم شماری میں اُن کی تعداد 3592 تھی۔

چونکہ 90 فیصد شتر بان افغان پاوندے تھے اِسی لیے اُنہیں افغان شتر بان کہا جاتا ہے مگر اُن میں چند مری، بلوچ اور راجہ ستان کے لوگ بھی تھے مگر یہ تمام لوگ مسلمان ہی تھے۔

آسٹریلیا کے دُور دراز خطوں کی تسخیر، تلاش، کھوج اور ارتقاء کے مقاصد کے لیے یہ شتر بان بہت اہمیت رکھتے تھے۔ 1890ء میں زمین کے راستے ٹیلی گرام لائن بچھانا، سڑکوں کے لیے راستوں کا تعین، کان کنی کے لیے رسد اور ضروری اوزار اور معدنیات کی ترسیل اور ریلوے لائن کی تعمیر کے لیے شتر بانوں اور اونٹوں کی اشد ضرورت تھی۔ اِسی طرح ڈاک کے نظام اور الیکشن کے لیے ضروری مواد اور الیکشن کے نتائج بروقت پہنچانا بھی اِن شتر بانوں کا کام تھا۔

جب 1901ء میں سفید فام آسٹریلیوی پالیسی کا باقاعدہ آغاز ہوا تو اُس کے نتیجے میں سفید فام یورپی اقوام کے سوا دیگر لوگوں کی آسٹریلیا میں آمد اور داخلے پر سخت پابندیاں لگیں۔

اِس پالیسی کا مقصد یہ بتانا تھا کہ آسٹریلیا صرف سفید فام لوگوں کا وطن ہے یوں افغانوں کی آمد پر بھی پابندیاں لگیں۔ جو لوگ 40/50 سال قبل یہاں آئے تھے وہ اب یا تو مر چکے تھے یا بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اُن میں اکثر لوگ غیر شادی شدہ تھے۔ انہیں اجازت نہیں تھی کہ سفید فام خواتین کے ساتھ شادیاں کریں اور نہ ہی یہ اجازت تھی کہ اپنے وطن سے اپنے خاندان اور خواتین کو لے کر آئیں۔ یہ افغان عمر رسیدہ ہو کر فوت ہونے لگے تو اِن کی آبادی گھٹتی گئی۔ پھر ترقی کے ساتھ ساتھ اُن کا مقابلہ نئی نئی ٹیکنالوجی سے ہوا۔ سڑکوں کی تعمیر گاڑیوں کے استعمال اور ریلوے نظام کی ترقی نے اونٹوں کے طویل کاروانوں جنہیں وہ Camelration کہتے تھے کی افادیت ختم کر دی۔

اگرچہ اُن کی آبادی کم تھی مگر اُن کی جانفشانی اور محنت کی وجہ سے اُن کی اہمیت اور اثرات بہت اہم تھے کیونکہ یہ معاشی ارتقاء اور تعمیرِ نو کے لیے ضروری لوگ تھے جنہوں نے آسٹریلیا کی تعمیر و ترقی میں تقریباً نصف صدی تک بہت اہم کردار ادا کیا۔ اکثر ابتدائی افغان آسٹریلیا میں ہی دفنائے گئے۔ اُن کے اپنے قصبات، مساجد اور قبرستان تھے۔ اُن کی محنت سے جو ریلوے لائن تعمیر ہوئی اُس پر چلنے والی ٹرین کو افغان ایکسپریس کا نام دیا گیا جو بعد میں بدل کر صرف "غان یا خان" ایکسپریس ہوا جو ایڈیلیڈ سے ڈارون شہر تک پہنچتی ہے۔ اِس کا آغاز 1929ء میں ہوا۔

خاتون ماہرِ عمرانیات نے لکھا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے وسائل اور معاشی ترقی کے لیے ہزاروں میل دور سے جفاکش اور مخلص لوگوں کو درآمد کیا مگر وہ نہ تو اپنی خواتین کو لا سکتے ہیں نہ یہاں سفید فام خواتین کے ساتھ شادی کر سکتے ہیں۔ مگر اِس کے باوجود ہم اپنے آپ کو مہذب اور اُن کو گنوار سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اکثر اُس وقت "اللہ اکبر" کہتے ہیں جب نماز کی دعوت دیتے ہیں۔ جب کسی اعلیٰ مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں، جب اُنہیں اُجرت مل جاتی ہے، جب وہ کسی جانور کو تیز دھار چھری سے ذبح کرتے ہیں تاکہ جانور کو زیادہ تکلیف سے بچایا جائے اور وہ یہ سارے کام صرف اور صرف ایک لاشریک اللہ کی رضامندی کے لیے کرتے ہیں یہی اصل انسانیت اور تہذیب ہے۔ اِسی عملی بنیاد پر مارگریٹ نے دینِ اسلام قبول کیا اور پھر تبلیغ کا یہ سلسلہ چل پڑا اور اُن شتر بانوں کو اللہ کی مدد سے آسٹریلیوی تاریخ میں قابلِ قدر مقام ملا۔

جو اونٹ افغان اپنے ساتھ لے کر آئے تھے وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی ضرورت باقی نہ رہی تو اُن کو جنگلات اور صحرائوں میں آزاد چھوڑ دیا گیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب دنیا بھر میں سب سے زیادہ جنگلی اونٹ آسٹریلیا میں پائے جاتے ہیں۔

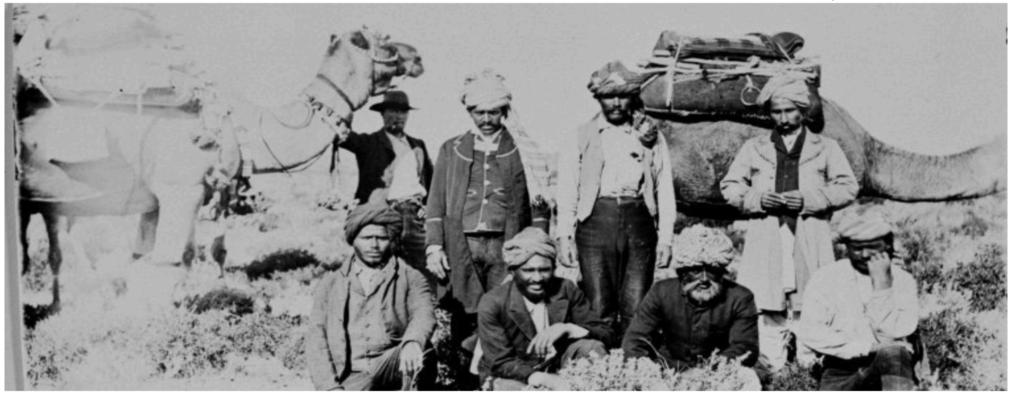

اُنہوں نے آسٹریلیا کی سب سے پہلی مسجد 1880ء میں اپنے وسائل سے تعمیر کی جسے بعد میں پختہ اور وسیع کیا گیا۔ آسٹریلیا میں دینِ اسلام کو اُس وقت انہی افغانوں نے متعارف کرایا۔ آسٹریلیا کے علاقے ماری Maree میں سب سے بڑا افغان قصبہ تھا جہاں اُنہوں نے اپنے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے لیے وسیع باڑے بنائے مسافروں کے لیے سرائے بنائیں جہاں تمام سہولیات تھیں، پکے گھر اور مساجد بنے، رات کو وہ اپنی تھکاوٹ دُور کرنے اور آرام کے لیے روایتی پشتون حجرے میں بیٹھ کر مشترکہ کھانا کھاتے اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتے۔ مگر اُن قصبوں کی آن بان اور شان مساجد ہی تھیں جن سے پانچ وقت "اللہ اکبر" اور "حیَّ الفلاح" کی پکار سنائی دیتی تھی۔

ایک سفید فام خاتون (Margrea Meade) جو ماہرِ عمرانیات و بشریات تھی، نے بہ آواز بلند کہا کہ تہذیب کی پہلی نشانی جدید ہتھیاروں کی مسلسل ایجادات اور ذخائر نہیں ہیں بلکہ کسی بھی مہذب معاشرے میں انسانیت کی فلاح سب سے افضل فریضہ ہے۔ اگر ہم انسانیت کی فلاح میں مدد گار ہوں گے تو ہی اچھے اور مہذب انسان کہلائے جائیں گے۔ اگرچہ مقامی لوگ ابتداء میں اِن پشتونوں کو غیر مہذب اور گنوار سمجھتے تھے مگر اب وقت کے ساتھ ساتھ سفید فام لوگوں میں بھی یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ ہمارا ابتدائی رویہ سخت متعصبانہ اور غیر مذہبی رہا ہے کیونکہ اللہ اکبر کی پکار قبولیت کی پکار ہے اور فلاح کی صدا کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی ضرورت مند انسان کی ابدی ضرورت پوری کی جائے اور دنیا اور آخرت میں اُس کی فلاح ہو۔

یہ جنگلی اور آزاد اونٹ اِس قدر زیادہ ہو چکے ہیں کہ اُن کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ حالانکہ اُن کا گوشت بہت سے عرب ممالک کو بھجوایا جا رہا ہے۔

تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو افغان 1850ء کی دہائیوں میں آسٹریلیا گئے تھے وہ عام سیاح اور مسافر نہیں تھے بلکہ اُس ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے والے سب سے اہم لوگ تھے۔ وہ اپنے کام کے ماہر اور سخت جان لوگ تھے جنہوں نے انتہائی مشکلات اور مذہبی اور نسلی منافرت کے باوجود آسٹریلیا کی تاریخ پر ان مٹ اور لازوال نقوش چھوڑے۔

اس تحریر کے مصنف دُر محمد کاسی، تمغہ امتیاز،
پاکستان ٹیلی ویژن کوئٹہ سنٹر کے جنرل منیجر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے اور پشتو زبان و ادب کے پہلے افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔

بشکریہ پی بی سی کوئٹہ

قلعہ سیالکوٹ: قدیم تاریخ سے موجودہ دور تک مکمل جائزہ

تحریر: فوزیہ طاہرہ

سیالکوٹ برصغیر کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے اور اِس کا قلعہ اِس شہر کی ہزاروں سالہ تہذیبی، سیاسی اور فوجی تاریخ کا خاموش گواہ ہے۔ اگرچہ وقت کے طویل سفر، جنگوں اور عدم توجہی کے باعث قلعے کا بیشتر حصہ باقی نہیں رہا لیکن اِس کے آثار آج بھی ماضی کی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔

قدیم سیالکوٹ اور قلعے کی بنیاد

قدیم زمانے میں سیالکوٹ کو ساکلہ (Sakala) کہا جاتا تھا۔ یہ خطہ قدیم مدرہ (Madra) سلطنت کا ایک اہم مرکز تھا۔ بعض تاریخی روایات کے مطابق سیالکوٹ کی بنیاد راجہ سَل یا راجہ سالبان نے رکھی، جبکہ بعض روایات اسے اِس سے بھی قدیم دور سے جوڑتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ راجہ سالبان نے شہر کو دوبارہ آباد کیا اور اِس کے دفاع کے لیے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کروایا۔ تاہم ماہرینِ تاریخ کے نزدیک قلعے کی موجودہ تعمیرات مختلف ادوار میں ہونے والی تعمیر و مرمت کا نتیجہ ہیں۔

یونانی دور اور سکندرِ اعظم کا زمانہ

326 قبل مسیح میں سکندرِ اعظم جب برصغیر آیا تو دریائے جہلم کے علاقے تک پہنچا۔ سیالکوٹ کے قدیم علاقے کا شمار اُس زمانے کے اہم مراکز میں ہوتا تھا۔ بعد ازاں یہ خطہ مختلف یونانی، ہندو اور مقامی حکمرانوں کے زیرِ اثر رہا۔ ساکلہ شہر قدیم ہندوستان میں علم، تجارت اور سیاست کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ قلعہ شہر کے دفاع کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔

کشان اور ہندو ادوار

کشان دور میں سیالکوٹ ایک اہم تجارتی اور ثقافتی مرکز رہا۔ اُس زمانے میں وسطی ایشیا، افغانستان اور ہندوستان کے درمیان تجارتی راستے یہاں سے گزرتے تھے۔ بعد کے ہندو ادوار میں بھی قلعہ شہر کے انتظامی اور دفاعی مرکز کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ مختلف حکمرانوں نے وقتاً فوقتاً اِس کی مرمت کروائی۔

اسلامی فتوحات کا دور

آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کی سندھ فتح کے بعد اسلام برصغیر میں پھیلنا شروع ہوا، تاہم پنجاب کے شمالی علاقوں میں مسلم اقتدار بعد کے ادوار میں مضبوط ہوا۔

1185ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے سیالکوٹ فتح کیا۔ اُس کے بعد قلعہ مسلم حکمرانوں کے قبضے میں آگیا اور اسے ایک فوجی چوکی کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔

دہلی سلطنت کا دور

دہلی سلطنت کے زمانے میں سیالکوٹ سرحدی اہمیت کا حامل شہر تھا کیونکہ یہ علاقہ وسطی ایشیا سے آنے والے حملہ آوروں کے راستے میں واقع تھا۔

قلعہ دفاعی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھا۔ مختلف سلاطین نے یہاں فوجی انتظام قائم رکھا تاکہ شمال مغربی حملوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

مغلیہ دور: قلعے کا عروج

مغل دور میں سیالکوٹ کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ بادشاہ اکبر کے زمانے میں پنجاب کی انتظامی تنظیمِ نو کی گئی اور سیالکوٹ ایک اہم انتظامی مرکز بنا۔

مغل دور میں قلعے کی مرمت اور مضبوطی کی گئی۔ قلعے کی فصیلیں، برج اور دفاعی نظام اُس دور میں بہتر کیے گئے۔ سیالکوٹ تجارت، زراعت اور دستکاری کے حوالے سے بھی ترقی کرتا رہا۔

سکھ دور

اٹھارویں صدی کے آخر میں پنجاب میں سکھ طاقت اُبھرنے لگی۔ رنجیت سنگھ کے دور میں سیالکوٹ سکھ سلطنت کا حصہ بن گیا۔

سکھ دور میں قلعہ فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہوا۔ تاہم اِس زمانے میں قلعے کی وہ اہمیت باقی نہ رہی جو مغل دور میں تھی۔

برطانوی دور

1849ء میں سکھ سلطنت کے خاتمے کے بعد پنجاب برطانوی حکومت کے قبضے میں آگیا۔

برطانوی دور میں قلعہ کچھ عرصہ فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہوا مگر جدید فوجی ضروریات کے باعث اِس کی اہمیت کم ہوتی گئی۔ وقت کے ساتھ قلعے کے کئی حصے متاثر ہوئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد

1947ء میں پاکستان کے قیام کے بعد قلعہ سیالکوٹ قومی تاریخی ورثے کا حصہ بن گیا۔

بدقسمتی سے طویل عرصے تک مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے قلعے کی حالت خراب ہوتی گئی۔ تجاوزات، موسم کے اثرات اور وقت کی گردش نے اِس کی عمارت کو نقصان پہنچایا۔

موجودہ حالت

آج قلعہ سیالکوٹ کے صرف کچھ حصے باقی ہیں، جن میں قدیم فصیلوں کے آثار، دفاعی برجوں کے نشانات، پرانی تعمیرات کے کچھ حصے شامل ہیں۔

یہ قلعہ اگرچہ اپنی مکمل شان و شوکت کے ساتھ موجود نہیں، لیکن سیالکوٹ کی تاریخی شناخت کا ایک اہم نشان ہے۔

تاریخی اہمیت

قلعہ سیالکوٹ صرف اینٹوں اور پتھروں کی عمارت نہیں بلکہ یہ کئی تہذیبوں کا امین ہے:
قدیم ہندوستانی تہذیب، یونانی اثرات، بدھ دور، اسلامی سلطنتیں، مغلیہ ثقافت، سکھ سلطنت، برطانوی حکومت سب نے اِس قلعے کی تاریخ پر اپنے نقوش چھوڑے۔

بشکریہ پی بی سی سیالکوٹ

خاطر غزنوی مرحوم۔۔۔۔۔۔۔ ایک ہمہ رنگ شخصیت

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

تحریر: ڈاکٹر تاج الدین تاجور

جب تاریخ کسی خطے کی تہذیبی اور لسانی شناخت کو نئے زاویے دینے کا فیصلہ کرتی ہے تو وہ خاطر غزنوی مرحوم جیسے زرخیز اذہان کو تخلیق کرتی ہے۔ خاطر مرحوم پشاور کی اُن گلیوں اور ہواؤں کے امین تھے جہاں تاریخ کے ان گنت قافلوں نے پڑاؤ ڈالا جہاں علم و فن کے چراغ روشن ہوئے، پشاور کے گھوارے نے علم وادب اور دیگر فنونِ لطیفہ میں کیا کیا گوہر عطا کیے۔ دلیپ کمار، پرتھوی راج، راج کپور، زکریا خان، جیسے اداکار و فنکار، ایم۔ ایم شریف اور گل جی جیسے بڑے خطاط اور پینٹرز، زلفی بخاری اور پطرس بخاری جیسی فطین ہمہ جہت شخصیات، ادیب، فارغ بخاری، احمد فراز، محسن احسان جیسے بلند پایہ ادیب و شاعر جن کا ایک زمانہ معترف ہے پروفیسر خاطر غزنوی بھی اِسی قافلے کے بطلِ جلیل تھے، خاطر صاحب اِس مٹی کی ثقافت و زبان کے امین تھے۔ آپ محض ایک شاعر یا کالم نگار نہیں تھے بلکہ وہ خیبر پختونخوا کی ہمہ رنگ زمین اور راستوں سے پھوٹنے والے ایک ایسے چشمہ علم و ادب تھے جس نے اُردو، ہندکو اور پشتو زبانوں کو باہم گلے ملنا سکھایا۔

خاطر غزنوی کا اصل نام مرزا محمد ابراہیم بیگ تھا۔ آپ 25 نومبر 1925ء کو تاریخی شہر پشاور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندانی شجرہ اور اصل تعلق افغانستان کے تاریخی شہر غزنی سے تھا جہاں سے آپ کے بزرگ ہجرت کر کے پشاور کی زرخیز مٹی کا حصہ بن گئے۔ غزنی کی علمی و تاریخی جڑیں اُن کی رگوں میں دوڑ رہی تھیں جس نے آگے چل کر اُن کی شخصیت کو مٹی سے محبت اور آفاقی فکر کا حسین امتزاج بنا دیا۔

پشاور میں پرورش پانے کے سبب اُنہوں نے یہاں کی گن گا جمنی تہذیب، خاص طور پر ہندکو اور پشتو ثقافت کو اپنے رچاؤ میں سمو لیا۔ خاطر غزنوی کی شخصیت کئی کمالات سے عبارت تھی۔ آپ شاعر و ادیب، پروڈیوسر، نقاد و محقق، اسکرپٹ رائٹر اور ڈرامانگار، مدرس و منتظم، صحافی، مترجم، فوٹو گرافر اور ماہر زبان تھے۔ قدرت نے آپ کو زبانوں پر غیر معمولی قدرت اور ملکہ عطا کیا تھا۔ آپ ایک ماہرِ لسانیات تھے۔ اُنہوں نے نہ صرف اپنے خطے کی زبانوں (اُردو، ہندکو، پشتو) پر کماحقہ عبور حاصل کیا بلکہ انگریزی، فارسی اور دورِ جدید کی عالمی زبانوں جیسے چینی اور ملائی پر بھی گہری دسترس رکھتے تھے۔ زبانوں کا یہ وسیع علم اُن کے تنقیدی اور تحقیقی کاموں میں ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوا۔

خاطر غزنوی کی پیشہ ورانہ زندگی فکر و دانش کی ترویج سے عبارت ہے۔ اُنہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز ریڈیو پاکستان پشاور سے بطور اسکرپٹ رائٹر شروع کیا اور کچھ عرصہ بعد ریڈیو پاکستان میں بطور پروڈیوسر منتخب ہو گئے جہاں اُنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا لوہا منوایا۔ ریڈیو میں ملازمت کے دوران ہی اُنہوں نے جامعہ پشاور سے اُردو میں ایم اے کیا اور اپنی قابلیت کی بنیاد پر اِسی جامعہ کے شعبۂ اُردو میں لیکچرر مقرر ہو گئے۔ بعد ازاں اُنہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی اور یوں وہ "خاطر غزنوی" سے "پروفیسر خاطر غزنوی" بن گئے۔ خاطر غزنوی کے شعری شہ پاروں میں 'روپ رنگ'، 'خواب در خواب'، 'شام کی چھتری' اور 'کونجاں' شامل ہیں، جبکہ اُن کی نثری تصانیف میں 'اُردو زبان کا ماخذ: ہندکو'، 'زندگی کے لیے پھول'، 'پھول اور پتھر'، 'چٹانیں اور رومان'، 'رزم نامہ'، 'سرحد کے رومان'، 'پشتو متلونہ'، 'دستار نامہ'، 'پٹھان اور جذباتِ لطیف'، 'خوشحال نامہ'، 'چین نامہ'، 'اصنافِ ادب'، 'ایک کمرہ' اور 'جدید اُردو ادب' نمایاں ہیں۔

1984ء میں پروفیسر خاطر غزنوی کو اکادمی ادبیاتِ پاکستان کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ خاطر غزنوی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان سے کیا اور کمالِ قدرت دیکھیے کہ یہی ادارہ اُن کی ملک گیر شہرت کی سب سے بڑی سبیل بھی بنا۔ اُن کی لازوال غزل "گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے" کو پاکستان کے متعدد نامور گلوکاروں نے اپنی آواز کا حُسن دیا اور یہ غزل ریڈیو پاکستان کے مختلف مراکز سے نشر ہوتی رہی۔ تاہم جب ریڈیو پاکستان لاہور سے مہدی حسن کی مترنم آواز میں یہ غزل نشر ہونا شروع ہوئی تو گویا خاطر غزنوی کی شہرت کو پر لگ گئے۔ مہدی حسن جب اپنے مخصوص درد، ٹھہراؤ اور سوز کے ساتھ "کیا قیامت ہے کہ خاطر..." ادا کرتے تو واقعی سننے والوں کے دلوں پر قیامت ڈھا جاتے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے یہ محض ایک شعر نہیں بلکہ جدائی، محبت اور بچھڑ جانے کے کرب کی پوری داستان ہو۔ اِس غزل میں ڈوب جانا تو آسان لگتا تھا، مگر اِس کے سحر سے جان جوکھوں کا کام تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ غزل ہر خاص و عام کی زبان پر چڑھ گئی اور خاطر غزنوی کا نام اُردو غزل کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔

حکومتِ پاکستان نے خاطر غزنوی کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں صدارتی تمغہ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔

7 جولائی 2008ء کو پروفیسر خاطر غزنوی پشاور میں انتقال کر گئے۔ وہ پشاور کے قبرستانِ رحمان بابا میں آسودہ خاک ہیں۔ خاطر غزنوی نے اُردو اور ہندکو شاعری کو ایسی تخلیقات سے مالا مال کیا جو آج بھی تازگی، فکری گہرائی اور فنی پختگی کا استعارہ سمجھی جاتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں محبت، ہجر، انسانی رشتوں کی نزاکت اور زندگی کے نشیب و فراز نہایت سادہ مگر دل نشیں انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اُن کا ادبی سرمایہ آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہے گا۔

بشکریہ پی بی سی پشاور

نئ نظم میں ظہور نظر کی آواز

تحریر: علی تنہا

سید منظور علی شاہ اُردو کی ادبی دنیا میں علی تنہا کے نام سے معروف ہیں۔ اُن کی تخلیقی زندگی کا بنیادی حوالہ تو افسانہ ہے لیکن وہ موسیقی سمیت فنونِ لطیفہ کی مختلف اصناف پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اُن کے چار افسانوی مجموعے جبکہ تنقیدی اور شخصی خاکوں پر مبنی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ترقی پسند شاعر مرحوم ظہور نظر کی شعری کائنات کا تذکرہ اُنہیں ہمیشہ محبوب رہا ہے۔ اِسی وجہ سے انہیں ظہور نظر شناس بھی کہا جاتا ہے

☆☆☆

ظہور نظر کی ایک نظم 'ریت کی دیوار' کی ابتداء کچھ یوں ہے:

اِس قدر سرد ہوا، اتنی بیابانیِ دل
اتنی مغموم وفا، پہلے نہ دیکھی نہ سنی
یاد کا کیا ہے سرِ دشتِ وفا
یاد تو اب بھی درخشاں ہے،
مگر تو ہی بتا!
ریت کے ڈھیر سے ابرق کی کرن کس نے؟
چاند کے نور سے پوشاکِ سحر کس نے بُنی؟

زندگی کی دریافت شعر کی سطح پر ہر بڑے فنکار کا بنیادی وظیفہ رہا ہے مگر اِس کے لیے وہ کن مرکزی تصورات کی اساس پر عمارت کھڑی کرتا ہے، یہ ایک طرح سے پہلا سوال ہے جسے دریافت کیے بغیر فن کو اپنے پورے وجود کے ساتھ سمجھا ہی نہیں جا سکتا اور اِسی لیے میں نے ظہور نظر کی ایک پرانی نظم سے ابتداء کی تاکہ لفظوں کی ساخت اور بُنت کی ہنر مندی سے اِس طرزِ احساس کو واضح کیا جا سکے جس نے بتدریج ظہور نظر کی نظم میں ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ اصل میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جس میں نظم کے نظریاتی وقوع کو آگے بڑھایا گیا اور معاشی ناہمواری کے مختلف درجات کو نمایاں کیا گیا، اِس میں بہتوں نے تو دو جمع دو۔ چار سے بھی تعامل نہیں کیا۔ مگر ہمیں یہ جاننے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے کہ اِسی تحریک نے جہاں افسانے، تنقید، غزل اور تحقیق وغیرہ میں ایک پورا نظامِ فکر خلق کیا،

اِس میں فیض، ندیم، اخترالایمان اور ظہور نظر جیسے حساس فنکاروں کے فنی اختصاص سے پورا شعری منظر نامہ ہی بدل گیا۔ اول الذکر دو شاعروں سے قطع نظر، ظہور نظر شہرت اور فنی اعتبار سے اپنے سفر میں انفرادیت کے باوجود کچھ دھیما رہا۔ اُس کی وجھوں میں اِس کے پورے فکری اور فنی اعمال کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات اجنبی بھی نہیں رہتی لیکن نئ نظم میں ظہور نظر کی فنی، ہیٔتی اور اسلوبیاتی کارسازی سے جو کچھ برآمد ہوتا ہے، وہ دو اعتبارات سے بہت اہم ہے۔ پہلا: نقطۂ نظر کے ماتحت شعر میں زندگی کا پورا شعور اور پھر اِس کے آخری دور میں تہذیبی اجمال کا مکمل تجربہ۔ اِس کے یہ دو فنی منہاج اگر زمانی تناظر میں دیکھیں تو اِس کی ترتیب کچھ یوں بنے گی:

پہلا دور 1945ء سے 1955ء تک جب وہ محض رومانیت اور احتجاج کو اول و آخر مانتے رہے۔

دوسرا دور 1955ء سے 1966ء تک ہے جب اُن کی نظریاتی شاعری میں زندگی کی آگہی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُن کا شعری دور 1966ء سے 1981ء تک زبردست تخلیقی تجربے میں تنظیم اور آگہی کو جز وقتی واردات کے بجائے کلیت کے ساتھ پہچان کروانے کا ہے مگر اپنے فنی انضباط کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ نظریے کے ماتحت شعر کہنا خون تھوکنے کے مترادف ہے۔ اِس کے لیے متذکرہ زمانی تقسیم میں اُن کی اکثر نظمیں اجتماع کے سیاسی آشوب کی آئینہ دار ہیں۔ ظہور نظر کے ہاں نقطۂ نظر میں وحدت کا یہ اثر ضرور ہوا کہ اندر کی کشاکش اور خارج کی پیکار سے جھنجھلاہٹ نے ابتدائی لہجے کو کاٹ کر زندگی کے مظاہر میں جبر کے مقابل چیلنج کی صورت اختیار کی۔

خود فراموشی میں جینا بھی کوئی جینا ہے؟
کوئی حسرت،
کوئی ارماں،
کوئی اُمید تو ہو
اتنی خاموشی، اتنی خاموشی میں جینا بھی کوئی جینا ہے؟

چونکہ ہمارے ہاں ادبی اقدار کا وہ فروغ نہ ہوا جو تمدنی زندگی میں مطلق شائستگی کا شارح ہوتا ہے اور جہاں تک شاعری میں فریضے کی تکمیل کا سوال ہے، اِس پر گامزن ہونے والوں نے جس سطحیت کو رواج دیا، وہ ایک الگ افسوسناک بحث ہے۔ ظہور نظر نے زندگی کی ماہیت میں جن مسائل کو کھوجنا چاہا، اُس میں ایسی آوازوں کا ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں جس سوسائٹی میں بے چہرگی اور عدم توازن عروج پر ہو، وہاں انسانی حقیقت کی تلاش بڑا ہی مشکل کام ہے۔ اِس ناہمواری میں خاموشی کو توڑنا زندگی میں تحرک لانے کا نام ہے۔

مجھے تمہارے حقیر ہونے اور باضمیر ہونے میں شک نہیں ہے
کہ میں بھی تم میں سے ایک ہوں اور جانتا ہوں
کہ تم جو اتنی مدت سے خاموشی کی دبیز چادر لپیٹ کر سو رہے ہو،
کیا ہو؟
کہ تم جو اندوہ کے اندھیرے، خوف کی خاردار چادر
لپیٹ کر سو رہے ہو، کیا ہو؟
سنو کہ جو بات ہونے والی تھی، ہو رہی ہے
میں اُس کا آغاز کر چکا ہوں
اُٹھو اور اپنے لہو لہو لب
میری صدا کے لبوں پہ رکھ دو

واقعہ یہ ہے کہ جس نظریۂ حیات کے نفوذ کے لیے ماحول سازگار نہ ہو اور نقطۂ نظر کا بہاؤ خارجی اشیاء سے برابر متصادم ہوتا رہے، اِس کے لیے لازمی نتائج تشکیک کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟

اِس ابتدائی زوال میں یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ نظریے کی صحت مندی کو محض فن کے بل بوتے پر معاشرتی اصلاح کا واحد ذریعہ بنایا جائے۔ یہی باعث ہے کہ ظہور نظر کے فنی ارتقاء میں عہدِ رواں کا فکری رجحان غالب ہے اور آدمی کی جبلی نیکی کے مقابل سفّاک، ہیجان اور معاشرت کے اندوہ کی تصویریں یک بہ یک ظاہر ہوتی ہیں۔

ہم سفر! عمرِ گریزاں!
کچھ تو بول
کس طرف جاؤں؟
کہاں پاؤں اماں؟
آبنائے خوف کے اِس موڑ سے
دُور کتنی ہیں سکوں کی بستیاں؟
ہیں بھی؟
یا اب آنے والے روز و شب
کاٹنے ہوں گے سکوں کی یاد میں
بے اماں طوفانِ ابر و باد میں

بے تعلقی کی پہچان کو اور مربوط زندگی میں جا کر تلاش، ظہور نظر کے فن کا مرکزی استعارہ رہا۔ لیکن سیاسی شکست و ریخت کے بار بار مزاحم ہونے سے بچایا اور اُسے ایک کامل فنی شکل دی۔ اِس صورتِ حال کو ہمارے ادب میں 1960ء کے عشرے میں افتخار جالب، انیس ناگی، عادل منصوری اور عباس اطہر وغیرہ نے بھی محسوس طریقوں سے لفظ کے کھردرے اظہار سے ظاہر کرنے کی مساعی کی۔ مثلاً یہ خارجی اور مغربی ادبی رویوں کے تصادم سے جنم لینے والی وقوع پذیری تھی مگر اِس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ اِس لسانی وغیرہ اور جتنے بھی اُس زمانے میں شعر کی اور افسانے کی سطح پر تجربات ہوئے تھے، اُس کے برعکس ظہور نظر نے معاشرتی شیرازہ بندی کی، اُس کی بحرانی کیفیت میں ظفر اقبال علوی اور عباس اطہر تک آتے آتے اسلوبیاتی طوفان کی نذر ہونے کے بجائے مجید امجد کے بعد ظہور نظر نے کھردری لفظیات کے فیشن کو یکسر مسترد کر دیا اور نئ لفظیات کو جنم دیا۔ تجربات کے نئے امکانات کو وسیع تناظر میں نئ زندگی دی۔ نیز، نظم کے زیریں رو میں تمام امتیازات بحال رکھے جو روایت اور نئے موسموں کے ذائقے سے مرتب ہوتے ہیں۔

فضا کی دہشت سے کانپتی دھوپ

زرد رو آفتاب کے ساتھ قتل گاہِ فلک کا زینہ اُتر رہی ہے
سفر کے زخموں سے چور دن اپنے آخری سانس گن رہا ہے
میری لرزتی ہوئی نظر پر
یہ لفظ تحریر ہو رہے ہیں
پناہ مانگو،
شقاوتِ وقت سے ہمیشہ پناہ مانگو

ظہور نظر نے جس شعری کیفیت کو حیاتی پیکر میں تراشا ہے، اُس کے پیچھے تمدن اور روایت کا صدیوں پرانا خراج موجود ہے، کیونکہ وہ خارجی حقائق کے وقوف میں اندر دیکھنے کی صلاحیت سے پوری طرح متصف ہے اور برصغیر کی مابعد میں سماجی اقدار کو اپنی اصل شکل میں سچے اور کھرے پیش منظر میں دیکھ سکتا ہے۔ وہ اِن تہوں میں اگر نتائج کی خود ساختہ وضاحت نہ کرتا تو یقیناً اس کی نظم کا دائرہ عمل زیادہ وسیع زمانی احاطے میں رہتا مگر ظہور نظر کی ذہنی تربیت میں اضداد کی پرورش نمایاں ہے،

لہٰذا وہ اقتدار کی جنگ میں لفظی اظہار کی وضاحت میں زیادہ گرفتار رہے ہیں اور انسانی اخلاقیات کو نظریاتی آئینے میں دیکھ کر حزنیہ پیرائے سے علامت کی تکمیل کرتے ہیں۔ اُن کی یہ علامات مکانی حد بندی میں اختلاف و مماثلت کا عجب ذائقہ رکھتی ہیں۔

خواب جو بھی خوب صورت تھا مرا
قلزمِ ماضی کی موج ہند میں گم ہو گیا
عرصہ دشت عدم کی دھند میں گم ہو گیا
پاس میرے
اب سوائے انبساط ناگہاں کچھ بھی نہیں

اُن کی شاعری میں بعض مقامات پر انسانی تعلقات کا دائرہ کار نئ دنیاؤں کی دریافت میں سچائیوں کا جنگل اِس واسطے ہے کہ نظریے کی پاک بازی میں داخلی کائنات کا استعارہ کی اپنی چمک ماند نہیں ہونے دیتا:

جب گونج کر بھی کوئی صدا بولتی نہیں
جب راستوں کے راز زمیں کھولتی نہیں
جب آسماں کے پاس اشارہ کوئی نہیں
جب میری دسترس میں ستارہ کوئی نہیں
اِس انہدامِ ذات کی تاریک رات میں
جانا ہے آج مجھ کو تلاشِ ثبات میں

یہ تلاشِ ثبات ہی سچائیوں کے جنگل کا راستہ ہے جسے شاعر نے وقت کی تہوں کے گنجلک مقامات سے نکالا ہے۔ جس کی تلاش میں دوسرے علوم اپنے مطالبات بہت بعد میں کرتے ہیں لیکن شاعر نے اُسے انسانی روح کا نغمہ اِس کمال سے بنایا ہے کہ فی الحقیقت اِس ہیئت میں زمانی شعور کا نقش بہت گہرا بنا ہے۔ اِس جمالیاتی قدر میں ظہور نظر کا سارا شعری نظام اِس سرگرمی میں ظہور پذیر ہوتا ہے کہ وجود کے ظاہری مظاہر میں انسانی جبلتوں کے متبائن حصے اپنے ماحصل کے طور پر سامنے آئے ہیں اور اثبات کے نغمے میں افکار کا پیچ دار زینہ کھلتا ہے، گویا وہ اِن دو حقیقتوں سے نظم میں نئ دنیاؤں کو تلاش کرتا ہے:

اگر یہ اسرار کھل گیا ہے
کہ برگ میں، اور تو ہوا ہے
تو اِس میں رونے کی بات کیا ہے
ابھی تو میں شاخ پر ہوں اور سبز بھی ہوں
ابھی تو میں تیری ہر ادا کو سراہتا ہوں
ہر ایک لرزش، ہر ایک لغزش کو چاہتا ہوں
ابھی تو تجھ کو بھی پیار ہے میری تازگی سے شگفتگی سے
ابھی سے تُو کیوں ہے دل گرفتہ
نظر کو دیوار سے ہٹا لے
کہ لوحِ دیوار پر نوشتہ
نہیں ہے برگ و ہوا کا رشتہ

یہ مقامات روح اور بدن کے مابین جدال کی حالتوں پر دال ہیں، کیونکہ بیسوس صدی کی مختلف ادبی و فکری تحریکات اور اُن کے رد عمل کے طور پر وقوع پذیر حالتیں ہمارے ہاں باہم دست و گریباں ہی رہیں۔ سو ہمارے ہاں ادبی تجربات میں پھیلاؤ کا تناسب ہر پھر کے مجید امجد، ظہور نظر یا اب ساقی فاروقی اور ثروت حسین کے شاعرانہ آہنگ سے آگے جاتا دکھائی نہیں دیتا۔ اِس وسعت میں مشکل یہ آپڑی کہ ہمارے ہاں وہ تبدیل مقامات جو روایت کی مابعد الطبیعات سے مملو ہیں، اُنہیں اپنے سیاق و سباق میں دیکھنے کے بجائے درآمدہ نظریات کی روشنی میں پرکھا گیا اور یوں مٹی کی اصل میں آمیزش سے وہ کامل آہنگ پیدا ہونے سے رہ گیا جس کے بلیغ اشارے نئے ادبی رشتوں میں زمان گیر اسباب کے متحمل ہوتے۔ اِس صورت میں نئ نظم کے تمام نئے اور پرانے تجربات میں ظہور نظر کی آواز تخلیقی کرب میں غنیمت ہے، اِس لئے اُن کے آخری دنوں کی نظموں میں آگہی اپنی سالم حالت میں درجۂ کمال پر ہے:

تارے تارے پر مثال ابر سے چھایا ہے وہ
بھولنے نکلا تھا جس کو، کتنا یاد آیا ہے
وہ شام کو جو صورت حالات غم تھی اب بھی ہے
شام جتنی شدر و حیران و نم تھی اب بھی ہے
جاں کنی اور تشنگی جیسے بہم تھی اب بھی ہے
رحم کی اُمید جتنی پہلے کم تھی اب بھی ہے

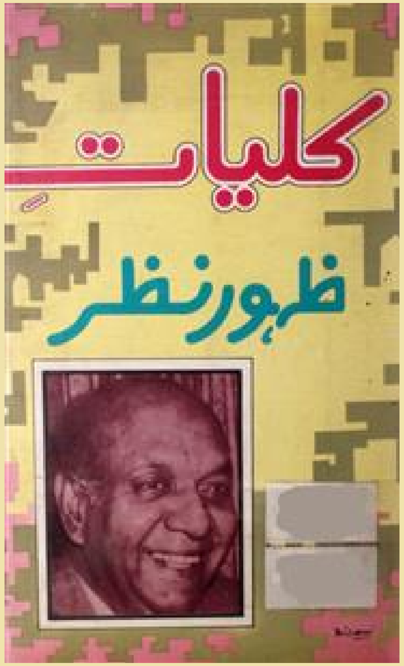

ظہور نظر کی اِن تمثالوں، استعاروں اور علامات کا جہان اِس لئے بھی نقطۂ نظر کی روشنی میں زیادہ مستحکم و متوازن ہے کہ اُس کے ہاں زندگی کا مشترکہ تجربہ پورے وفور کے ساتھ موجود ہے اور موضوعات و اسالیب کے دھارے کہیں بھی کند نہیں ہوئے بلکہ زندگی اپنی پرکار میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے، کیونکہ ظہور نظر یہ تمام حُسن تجربے کے اولین انکشاف کے ساتھ سرانجام دینے پر قادر ہے، اور ایک طلسماتی گرفت کے ساتھ زندگی کے پوشیدہ رقبوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر کر دیتا ہے۔ اُس میں اِس کے لسانی آہنگ اور اُن افعال و کیفیات کا بڑا ہاتھ ہے جو شاعر کو کائنات گیر وارداتوں کا کشف دیتی ہیں۔

ظہور نظرنے زندگی کے اِن مقامات کی حیرت زا حالت کو مختلف صورتوں میں متحد کیا ہے جو اپنے وجود میں بظاہر اظہار کی حد سے باہر نظر آئی ہیں۔

بشکریہ پی بی سی بہاولپور

دنیائے موسیقی کا درخشاں ستارہ

سولہویں صدی عیسوی برصغیر میں مغلوں کا دور اُس دور کے عظیم بادشاہ، جلال الدین اکبر کی حکومت میں فن و ثقافت کی بے مثال ترقی اور ترویج، دربار شاہی میں فنونِ لطیفہ کا چرچا، ہر فن کے ماہروں کی سرپرستی، فنِ موسیقی کے سالارِ کارواں تان سین کی محفلیں اور اُن کے علاوہ بھی کئی بڑے بڑے فنکار اُس دربار سے وابستہ رہے۔ تو کیوں نہ موسیقی کا سفر بھی اپنے عروج کی طرف تیزی سے بڑھتا مختلف راگ وجود میں آئے سازوں کی نوک پلک سنواری گئی، لوک موسیقی کے سرسبز باغ، نئے نئے شگوفے پھوٹنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسیقی دوسرے تمام فنون سے آگے نظر آنے لگی۔ برصغیر میں جس طرح اُردو زبان کے دبستان لکھنؤ اور دہلی قائم ہوئے، اُسی طرح موسیقی کے گھرانے وجود میں آئے۔ اُن میں سب سے نمایاں گوالیار گھرانہ تھا۔ تان سین کا تعلق بھی اُسی گھرانے سے جوڑا جاتا ہے۔ یہ گھرانہ شہنشاہ اکبر کے دور میں قائم ہوا تھا اور اِس کے بانیوں میں استاد نتھن خاں پیر بخش اور اُن کے پوتے ہدّو اور حسّو شامل تھے جبکہ اُستاد بڑے خاں بھی دربارِ اکبری سے وابستہ تھے جو تان بازی میں مشہور تھے۔ اُستاد نتھن خاں اپنے پوتوں کے ساتھ گوالیار میں آکر بسے اور یہیں اُنہوں نے خیال کی گائیکی کو فروغ دیا۔ اِس طرح یہ گھرانہ گوالیار گھرانہ کہلایا۔ گوالیار گھرانے کی موسیقی کی نمایاں خصوصیت اِس کی سادگی ہے۔ اِس میں چند مشہور راگ منتخب کر کے گائے جاتے ہیں تاکہ سننے والوں کو راگ کی پہچان میں مشکل نہ پیش آئے اور اُن کی دلچسپی برقرار رہے۔ اِس کے علاوہ راگ کی خوبصورتی کو بڑھانے کے لئے اِس میں راگ وستارا اور الن کار کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ بندش یعنی کمپوزیشن کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ جو مشہور راگ منتخب کئے جاتے تھے اُن میں الیہ بلاول، بھایئم، سارنگ، شری ہیم ر اور بھیرویں شامل ہیں۔

گوالیار گھرانے کے سلسلے کے نامور فنکاروں میں اُستاد اُمید علی خاں کا نام بھی آتا ہے۔ اُستاد اُمید علی خاں 1910ء میں امرتسر میں موسیقی کے ایک مشہور خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اُستاد پیارے خاں اپنے وقت کے مانے ہوئے فنکار تھے۔ چنانچہ آپ نے اُن سے نے تربیت حاصل کی۔ ایک اور روایت کے مطابق اُمید علی خان کا تعلق موسیقی کے دوسرے بڑے گھرانے یعنی پٹیالہ گھرانے سے جوڑا جاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے آباؤاجداد میں سے بعض افراد پٹیالہ گھرانے کے اُستادوں کے شاگرد تھے۔ پٹیالہ گھرانے کی گائیکی گوالیار گھرانے سے مختلف ہے۔ یہ گھرانہ غزل، ٹھمری اور خیال گانے کے لئے مشہور ہے۔ اِس گھرانے کی بنیاد اُستاد فتح علی خاں نے رکھی جبکہ مہاراجہ پٹیالہ نے اِس کی سرپرستی کی۔

پٹیالہ گھرانے کی گائیکی چھوٹی بندش اور فنکارانہ انداز کی وجہ سے بہت مقبول ہے۔ اِن کی سب سے بڑی خصوصیت تان کی ادائیگی ہے جس میں فنکاری کے جوہر دکھائے جاتے ہیں۔ اِس میں لے کو قائم رکھتے ہوئے کئی طرح کے انداز اختیار کئے جاتے ہیں۔ دلشاد خان، اُستاد امانت علی خان اور فتح علی خان نام نمایاں ہیں۔ لیکن اُستاد اُمید خاں کو بنیادی طور پر گوالیار گھرانے سے جوڑا جاتا ہے۔

فنِ موسیقی کی ترویج اور ترقی کے لئے جہاں شاہی درباروں اور راجا مہاراجوں کی سرپرستی کا بڑا ہاتھ تھا' وہاں موسیقی کی عام محفلوں سے بھی اِس کو فروغ حاصل ہوا۔ اِس سلسلے میں ایک بڑا اہم رواج مقابلے کا رواج تھا۔ پہلوانوں کے مقابلوں کی طرح موسیقی کے بڑے فنکارں کے درمیان بھی مقابلے منعقد کئے جاتے تھے جن میں باقاعدہ ایک جج مقرر ہوتا تھا جو فیصلہ کرتا تھا کہ گائیکی میں کس نے دوسروں پر فتح حاصل کی۔ اِن مقابلوں سے عام لوگوں میں بھی موسیقی میں دلچسپی بڑھنے لگی۔ پہلوانی کے مقابلوں کی طرح موسیقی کے مقابلوں کے لئے بھی کئی کئی دن تیاری کی جاتی تھی۔ عمدہ سے عمدہ خوراکیں کھائی جاتیں، صبح و شام ریاض کئے جاتے اور پھر مقررہ تاریخ پر یہ مقابلہ منعقد ہوتا۔ مقابلے کے لئے جج بھی فنِ موسیقی کا ایک عظیم اُستاد ہوتا تھا اور اُس کا فیصلہ دونوں کو قبول کرنا ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فیصلہ بھی بڑے انصاف سے کیا جاتا تھا۔ اُستاد امید علی خاں نے بھی ایسے مقابلوں میں شرکت کی۔ اِس سلسلے کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ اُمید علی خاں اگرچہ فن میں کافی ماہر ہو چکے تھے لیکن ابھی اُن کی عمر زیادہ نہیں تھی کہ اُن کے اُستاد بڑے غلام علی خان کے درمیان ایک مقابلہ طے ہوا۔ اُس مقابلے کے جج اُستاد الوحید خاں جن کا تعلق کیرانہ گھرانے سے تھا۔ مقابلے میں اُستاد امید خاں نے فن کے ایسے جوہر دکھائے کہ جج کو اُن کے حق میں فیصلہ کرنا پڑا۔ اِس موقع پر جج کے الفاظ تھے "یہ لڑکا مار گیا بازی"۔

اپنے وقت کے مانے ہوئے اُستاد سے اپنی تعریف میں یہ الفاظ سُن کر اُستاد امید علی خاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اور یقیناً اِس سے اُن کے فن کو بھی تقویت پہنچی۔ اِسی طرح اُستاد اُمید علی خاں کا ایک مشہور مقابلہ اُستاد عاشق علی خاں کے ساتھ بھی ہوا جو آج کی نامور فنکارہ فریدہ خانم کے اُستاد تھے۔ اِس مقابلے میں اُستاد امید علی خاں نے للت اور شام کلیان پیش کئے اور حاضرین سے داد وصول کی۔ اُستاد اُمید خاں کو کئی راگوں میں مہارت حاصل تھی جن میں مالکونس، بھیرویں، بھیروں، درباری شامل ہیں لیکن اُن کو راگ کافی کا نڑا بہت پسند تھا اور وہ پہلے فنکار ہیں جنہوں نے اِس راگ کو پنجابی بندش کے ساتھ کر کے اُس کو سننے والوں اور موسیقی کے فنکاروں میں بے حد مقبول کرایا۔ اِس کے بول ہیں (لے جاندے نے نال) بادشاہوں اور امراء کی سرپرستی کے بعد محفلوں اور مقابلوں نے فنِ موسیقی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور جب برصغیر میں ریڈیو نشریات کا باقاعدہ آغاز ہوا تو موسیقی کی مقبولیت دن دگنی رات چوگنی بڑھنے لگی۔ ریڈیو پر موسیقی کے پروگرام شروع ہوئے اور فنکاروں کے لئے شہرت کے دروازے کھل گئے۔ اِس میں کلاسیکی موسیقی کے پروگرام ہوتے تھے اور غزلیں بھی نشر ہوتی تھیں۔ موسیقی میں نئے نئے تجربے بھی ہونے لگے تو نئے فنکاروں کی صف میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اُستاد اُمید خاں نے بھی ریڈیو سے کئی پروگرام نشر کئے۔ ابتداء میں یہ پروگرام براہِ راست نشر ہوتے تھے یعنی ریکارڈنگ کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ پھر بعد میں ریکارڈنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو موسیقی کے اُستادوں کے بھی آئٹمز ریکارڈ کئے جانے لگے۔ زمانہ اور آگے بڑھا تو ریکارڈنگ کمپنی قائم ہوئی اور پھر اِن فنکاروں کے بھی ریکارڈ منظرِ عام پر آ گئے۔ اِس طرح نہ صرف موسیقی کا فن اپنے عروج پر پہنچا بلکہ اِن فنکاروں کے لئے بھی آگے بڑھنے کے مواقع پیدا ہونے لگے۔ اِن کی شہرت دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی پہنچنے لگی اور اُن ممالک میں بھی محفلیں سجنے لگیں۔ اُستاد امید علی خاں کو بھی بیرونِ ملک اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا اور وہاں بھی اُنہوں نے لوگوں سے داد وصول کی۔ وہ ابھی فن کی بلندیوں پر ہی تھے کہ اُن کے کانوں میں تکلیف شروع ہو گئی اور ایسی بڑھی کہ اُن کی سماعت جاتی رہی۔ ابتدائی علاج سے کوئی فرق نہ پڑا تو علاج کے لئے انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں بھی اُن کا علاج کامیاب نہ ہوا بلکہ وہ معاملہ ہوا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اُستاد اُمید خاں تقریباً ایک سال وہاں رہے اور بیماری کی حالت میں 1979ء میں اِس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اُستاد اُمید علی خاں کا فن نہ صرف اُن کی اپنی آواز کے روپ میں زندہ ہے بلکہ اُن کے خاندان کے دیگر افراد نے بھی اِس فن کو آگے بڑھانے اور اُن کا نام روشن رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اُستاد اُمید علی خاں کے بھتیجے اُستاد فتح علی خان اور اُستاد حمید علی خان فنِ موسیقی کے نامور فنکار ہیں اور وہ ریڈیو، ٹی وی اور مختلف محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اِس طرح یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ برصغیر میں موسیقی کی تاریخ اُستاد اُمید علی خاں کے نام کے بغیر ادھوری ہے۔

بشکریہ پی بی سی کراچی

جُگل بندی سے شہرت کمانے والے نامور گویے اُستاد نزاکت علی خان

محمد سعید احمد شیخ

برصغیر کے نامور کلاسیکی گائیک، جُگل بندی سے عالمی شہرت کمانے والے نامور گویے، شام چوراسی گھرانے کے درخشاں ستارے اور پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کی روایت کے امین اُستاد نزاکت علی خان کی تینتالیسویں برسی منائی جا رہی ہے۔

اُستاد نزاکت علی خان 1932ء میں ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) کے تاریخی قصبے شام چوراسی میں پیدا ہوئے جو اپنے عظیم پس منظرِ موسیقی کی وجہ سے پورے برصغیر میں شہرت رکھتا ہے۔ اُن کے والد اُستاد ولایت علی خان اپنے عہد کے ممتاز کلاسیکی موسیقار تھے اور بالخصوص دھرپد گائیکی میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ شام چوراسی گھرانے کی صدیوں پر محیط کلاسیکی روایت نے بچپن ہی سے اُستاد نزاکت علی خان کی شخصیت اور فن کو جِلا بخشی۔

اُستاد نزاکت علی خان اپنے چھوٹے بھائی اُستاد سلامت علی خان سے تقریباً دو برس بڑے تھے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے والد اُستاد ولایت علی خان سے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور نہایت کم عمری ہی میں ریاض اور سنگت کا آغاز کر دیا۔ بچپن ہی سے وہ محافلِ موسیقی میں ایک دوسرے کے ہم نوا بن کر شریک ہونے لگے۔ اُن کی آوازوں میں ایسی فطری ہم آہنگی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے نزاکت علی سلامت علی کی جوڑی برصغیر کی کلاسیکی موسیقی کی تاریخ کی عظیم ترین گائیک جوڑیوں میں شمار ہونے لگی۔ اُن کی جُگل بندی اِس قدر منفرد، متوازن اور دل نشیں تھی کہ موسیقی کے ناقدین نے انہیں جُگل بندی کا بادشاہ قرار دیا۔ اگرچہ دونوں بھائیوں نے ٹھمری، ٹپہ، ترانہ اور کافی سمیت کلاسیکی موسیقی کی متعدد اصناف میں اپنی مہارت کا لوہا منوایا، تاہم اُن کا اصل اختصاص خیال گائیکی تھا۔ اُنہیں خیال گائیکی پر غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ راگوں کی باریکیوں پر گہری دسترس، بول آلاپ، بول تان، سرگم، تان کاری اور بدیہی ارتجال میں اُن کی مہارت نے اُنہیں اپنے عہد کے عظیم ترین خیال گائیکوں کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا۔ اُن کی پیش کردہ بڑے اور چھوٹے خیال کی بندشیں آج بھی کلاسیکی موسیقی کے طالبِ علموں اور اساتذہ کے لیے نمونۂ کمال سمجھی جاتی ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد دونوں بھائیوں نے ابتدا میں ملتان میں سکونت اختیار کی۔ ملتان میں قیام کے دوران اُنہوں نے ملتانی (سرائیکی) زبان کے لہجے، مقامی لوک موسیقی اور ملتان کی معروف کافیوں کے مخصوص اُتار چڑھاؤ کو نہایت باریک بینی سے سیکھا اور اپنے فن میں سمو لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اِن دونوں بھائیوں کی آواز میں پیش کی گئی سرائیکی کافی عشق انوکھڑی پیڑ کلاسیکی اور لوک موسیقی کے حسین امتزاج کی لازوال مثال بن گئی۔ اِس کافی میں دونوں بھائیوں کی بے مثال ہم آہنگی، سوز، سُروں کی پختگی اور جذبات کی گہرائی آج بھی سامعین کو مسحور کر دیتی ہے۔ بعد ازاں وہ لاہور منتقل ہوئے جہاں ریڈیو پاکستان لاہور کی بدولت اُن کا فنی سفر مزید عروج پر پہنچا اور اُن کی آواز گھر گھر پہنچنے لگی۔ اُستاد نزاکت علی خان اور اُستاد سلامت علی خان نے پاکستان کے ساتھ ساتھ یورپ، مشرقِ وسطی، شمالی امریکہ اور ایشیا کے متعدد ممالک میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور شام چوراسی گھرانے کی عظیم روایت کو عالمی سطح پر متعارف کرایا۔ موسیقی کے ناقدین کے نزدیک اُن دونوں کی جُگل بندی، سُروں کی شفافیت، راگ کی علمی تفہیم، بے ساختہ تانوں اور ایک دوسرے کی آواز کے غیر معمولی امتزاج نے کلاسیکی موسیقی کی تاریخ میں ایک ایسا معیار قائم کیا جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ جس طرح برصغیر کی سازین موسیقی میں اُستاد اللہ رکھا خان اور پنڈت روی شنکر کی جُگل بندی کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، اِسی طرح کلاسیکی گائیکی میں اُستاد نزاکت علی خان اور اُستاد سلامت علی خان کی جوڑی کو ایک منفرد اور بے مثال مقام حاصل ہے۔ اگر اُستاد اللہ رکھا خان اور پنڈت روی شنکر نے طبلے اور ستار کے باہمی مکالمے کو فن کی معراج تک پہنچایا تو نزاکت علی خان اور سلامت علی خان نے اپنی آوازوں کی ایسی دلکش جُگل بندی پیش کی کہ دونوں کی ہم آہنگی، سوال و جواب، آلاپ اور تانیں کلاسیکی موسیقی کا لازوال سرمایہ بن گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ نزاکت علی سلامت علی کی جوڑی کو برصغیر کی عظیم ترین آوازی جُگل بندیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اُستاد نزاکت علی خان 14 جولائی 1983ء کو راولپنڈی میں وفات پا گئے۔ بعد ازاں اُن کا جسدِ خاکی لاہور منتقل کیا گیا جہاں انہیں میانی صاحب قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

حکومتِ پاکستان نے کلاسیکی موسیقی کے فروغ میں اُن کی بے مثال خدمات کے اعتراف میں اُستاد نزاکت علی خان اور اُستاد سلامت علی خان دونوں کو تمغۂ حُسن کارکردگی اور ستارۂ امتیاز سے نوازا۔

ریڈیو پاکستان کے ساتھ اُستاد نزاکت علی خان کی وابستگی کئی دہائیوں پر محیط رہی۔ اُن کی آواز میں محفوظ کلاسیکی راگ، ٹھمریاں، ٹپے، کافی اور دیگر نادر ریکارڈنگز آج بھی ریڈیو پاکستان کے صوتی خزانے کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اُن کی گائیکی آنے والی نسلوں کے لیے کلاسیکی موسیقی کا معتبر حوالہ اور شام چوراسی گھرانے کی زندہ روایت ہے۔ ریڈیو پاکستان کلاسیکی موسیقی کے اِس عظیم فنکار کی تینتالیسویں برسی پر انہیں بھرپور خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

شام چوراسی کا پنج پٹیہ گویا

اُستاد سلامت علی خان

محمد سعید احمد شیخ

وہ دسمبر 1934ء میں شام چوراسی گاؤں (ضلع ہوشیار پور) میں پیدا ہوا۔ فنی استعداد اِس قدر غیر معمولی تھی کہ اپنے والد اُستاد ولایت علی خان سے موسیقی کے بنیادی اور ابتدائی گرُ سُر سیکھ کر محض آٹھ سال کی عمر ہی میں اپنے بڑے بھائی اُستاد نزاکت علی خان کے ساتھ سنگت کے اہل ہوگیا۔ 1947ء کے ہندوستان کے بٹوارے نے اِس باکمال گویے کو، جب اُس کی عمر چودہ برس کی تھی، اپنی آبائی سرزمین شام چوراسی سے جدا کر دیا۔ مگر قدرت نے اِس ہجرت کے بدلے اسے ایک اور روحانی سرزمین عطا کر دی، جو شہرِ ملتان تھا۔ اولیاء اللہ کا شہر جسے درگاہوں سے اُٹھتی قوالیوں کی پُرکیف آوازوں اور کلاسیکی موسیقی کی اچھوتی نشستوں نے بڑا منفرد مزاج و مقام عطا کر رکھا تھا۔ اسی شہرِ ملتان نے اِس نوجوان گویے کو حضرت خواجہ غلام فرید کے عارفانہ کلام سے ایسا جوڑا کہ یہ تعلق پھر کبھی ٹوٹ نہ سکا۔ ملتانی کافیاں شام چوراسی گھرانے کی کلاسیکی روایت کا مستقل حوالہ بن گئیں۔ عشق انوکھڑی پیڑ، سانول موڑ مہاراں اور یار سپاہیڑا! آوس ماڈڑے کول جب اِس نوجوان کی آواز میں گونجتیں تو یوں محسوس ہوتا جیسے سرائیکی دھرتی کے صوفیانہ درد نے شام چوراسی کے راگوں سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئی جمالیات اختیار کر لی ہو۔

مگر اِس نوجوان کی فنی دنیا صرف کافی تک محدود نہ تھی۔ اِس کا اصل میدان خیال گائیکی تھا۔ اپنے بزرگ میاں کریم بخش مجذوب سے سیکھی خیال کی باریکیوں کو یہ نوجوان ایسی لے کاری اور ایسے پختہ سُروں اور تانوں کے ساتھ پیش کرنے لگا کہ بڑے بڑے موسیقی شناس انگشت بدنداں ہونے لگے۔ کیونکہ یہ اپنی آواز کی غیر معمولی وسعت کے سبب پانچ مختلف پٹیوں میں یکساں مہارت کے ساتھ گانے کی قدرت رکھتا تھا تو موسیقی دان اسے پنج پٹیہ گویا کہنے لگے۔

آج شام چوراسی گھرانے کے اسی پنج پٹیہ گویے، اُستاد سلامت علی خان کی پچیسویں برسی منائی جا رہی ہے۔ شام چوراسی گھرانہ بنیادی طور پر دھرپد گائیکی کی روایت کا امین تھا، لیکن اُستاد سلامت علی خان نے اپنے فنی سفر میں خیال، ٹھمری، کافی اور لے کاری کو اِس انداز سے یکجا کیا کہ ہر صنف میں اُن کی الگ شناخت قائم ہوئی۔ اُن کی تانوں میں رفتار تھی مگر بے ترتیبی نہیں، سُروں میں وسعت تھی مگر تصنع نہیں، اور لے پر ایسی قدرت تھی کہ پیچیدہ سے پیچیدہ تال بھی اُن کی آواز کے سامنے آسان محسوس ہونے لگتی تھی۔

تقسیمِ ہند کے بعد اُستاد سلامت علی خان کا خاندان تقریباً ایک دہائی تک ملتان میں مقیم رہا۔ یہ قیام محض رہائش نہیں بلکہ اُن کی فنی تشکیل کا دور ثابت ہوا۔ اسی شہر میں 1955ء میں اُن کے بڑے صاحبزادے اُستاد شرافت علی خان پیدا ہوئے۔ بعد ازاں یہ خاندان لاہور منتقل ہو گیا لیکن ملتان کا روحانی اور صوفیانہ رنگ اُن کی آواز میں ہمیشہ شامل رہا۔

1955ء میں وہ اپنے بڑے بھائی اُستاد نزاکت علی خان کے ہمراہ ہندوستان کے موسیقی کے دورے پر بھی گئے۔ ممبئی سمیت مختلف شہروں میں دونوں بھائیوں کی گائیکی کو بے حد سراہا گیا۔ اُستاد سلامت علی خان اور اُستاد نزاکت علی خان کی جوڑی تقریباً نصف صدی تک شام چوراسی گھرانے کی سب سے معتبر شناخت بنی رہی۔ دونوں بھائیوں نے کلاسیکی موسیقی کی بے شمار محفلوں میں اپنے گھرانے کی نمائندگی کی۔ ایک کی آواز میں ٹھہراؤ اور دوسری کی آواز میں حیران کن پرواز تھی مگر دونوں کا امتزاج ایسا تھا کہ سننے والے انہیں الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی فنی شخصیت کے دو رنگ محسوس کرتے تھے۔

1983ء میں اُستاد نزاکت علی خان کے انتقال نے اِس لازوال جوڑی کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ اِس سانحے نے اُستاد سلامت علی خان کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ اُن کے فنی سفر پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اِس کے بعد اُن کی محافل نسبتاً کم ہو گئیں لیکن ریاض، تدریس اور موسیقی کی خدمت کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوا۔ اُنہوں نے اپنے شاگردوں اور اپنے صاحبزادوں کو نہ صرف شام چوراسی گھرانے کی روایت منتقل کی بلکہ اِس کلاسیکی ورثے کی اصل روح بھی اُن کے سپرد کی۔

اُستاد سلامت علی خان کی زندگی کا ایک نہایت خوبصورت پہلو اُن کی گھرداری سے محبت بھی تھی۔ وہ ایک روایتی خاندانی انسان تھے۔ اپنی اہلیہ رضیہ بیگم کو محبت سے جیا کہہ کر پکارتے تھے۔ یہی نام بعد میں اُن کے فنی تخلص کا حصہ بن گیا اور اُنہوں نے جیا رنگ اختیار کیا۔ برصغیر کی کلاسیکی موسیقی میں اساتذہ کے تخلص رکھنے کی روایت پرانی ہے۔ اُستاد بڑے غلام علی خان صبر نگ کے نام سے معروف ہوئے، جبکہ اُستاد سلامت علی خان نے اپنی شریکِ حیات کی محبت کو اپنے فن کی شناخت بنا کر جیا رنگ کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔

وہ راگ کی حدود کا پورا احترام کرتے ہوئے اُس میں اپنے احساس، اپنی لے اور اپنی آواز کی وسعت شامل کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی گائیکی میں روایت اور جدت ایک دوسرے کی مخالف نہیں بلکہ معاون نظر آتی ہیں۔ اُنہوں نے ثابت کیا کہ کلاسیکی موسیقی اپنی اصل کو برقرار رکھتے ہوئے بھی ہر دور کے سامع سے مکالمہ کر سکتی ہے۔

اُن کی آواز کو پاکستان بھر میں متعارف کرانے میں ریڈیو پاکستان کا کردار بھی نہایت اہم رہا۔ اُن کے گائے ہوئے خیال، ٹھمریاں، کلاسیکی بندشیں اور حضرت خواجہ غلام فرید کی کافیوں نے ریڈیو پاکستان کی نشریات کے ذریعے لاکھوں سامعین تک رسائی حاصل کی۔ اُن کی ریکارڈنگز آج بھی ریڈیو پاکستان کے صوتی ذخیرے کا گراں قدر سرمایہ ہیں اور کلاسیکی موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک مستند حوالہ سمجھی جاتی ہیں۔

> اُستاد سلامت علی خان کا فن روایت کا اسیر نہیں تھا، بلکہ روایت کا امین تھا۔

تھرپارکر کے جگمگ ستارے

تحریر: خالد چانڈیو

تھرپارکر کی دھرتی اپنی رنگارنگ ثقافت، لوک موسیقی، روایتی فنون اور صحرائی حُسن کے باعث ایک منفرد شناخت رکھتی ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے رسم و رواج، دستکاری اور فنونِ لطیفہ کے ذریعے اپنی تہذیبی وراثت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ تھر کے گیت، رقص، کڑھائی اور لوک داستانیں اِس خطے کی روح کی عکاسی کرتی ہیں۔ تھرپارکر کی اِسی ثقافتی و فنی عظمت کے مختلف جگمگ ستاروں کا تعارف قارئین کی نذر۔

سندھ اور مارواڑ کی لوک موسیقی کی لازوال آواز

مائی بھاگی

مائی بھاگی برصغیر کی اُن عظیم لوک گلوکاراؤں میں شمار ہوتی ہیں جنہوں نے اپنی منفرد آواز، سوز و گداز اور فنکارانہ صلاحیتوں کے ذریعے سندھ کی ثقافت اور لوک موسیقی کو عالمی سطح پر متعارف کرایا۔ اُنہیں سندھی، مارواڑی اور تھری لوک گیتوں کی "کوئل" بھی کہا جاتا ہے۔ مائی بھاگی کی پیدائش تقریباً 1920ء میں ضلع تھرپارکر کے شہر ڈیپلو میں ونیل فقیر اور مائی خدیجہ المعروف کسی بائی کے گھر ہوئی۔

مائی بھاگی نے بچپن ہی سے اپنی والدہ کے ساتھ مل کر ڈھاٹکی، مارواڑی اور سندھی لوک گیت گانا شروع کر دیے تھے۔ اُن کے والد اور والدہ ہی اُن کے اولین اساتذہ تھے جنہوں نے اُنہیں موسیقی کی بنیادی تعلیم و تربیت دی۔ بعد ازاں وہ اُستاد محمد جمن اور اُستاد حسین فقیر کے فن سے بھی بہت متاثر تھیں۔

پندرہ برس کی عمر میں اُن کی شادی ہو گئی جس کے بعد وہ مٹھی منتقل ہو گئیں۔ قدرت نے اُن کی آواز میں ایسا درد، مٹھاس اور تاثیر رکھی تھی کہ سننے والے بے اختیار اُن کے سحر میں کھو جاتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں لوک گیت گائے جن میں سے متعدد آج بھی مقبول ہیں۔

اُن کے مشہور گیتوں میں "بھٹ جا بھٹائی"، "سمن سائیں مان تہ گولی غلام"، "کھڑی نیم کے نیچے"، "تارن مان ترندی اچے" اور "مونکھے جوگی ہنی دے ڈھارو" شامل ہیں۔ مائی بھاگی کو پہلی بار 1967ء میں بھالوا میں منعقد ہونے والے مارئی میلے کے دوران عوامی سطح پر پذیرائی ملی۔ چاندنی رات میں جب اُنہوں نے اپنے مخصوص انداز میں لوک گیت گائے تو حاضرین پر ایک سحر ساطاری ہو گیا۔ اِسی تقریب نے اُن کی شہرت کے دروازے کھول دیے۔ بعد ازاں وہ ریڈیو حیدر آباد سے متعارف ہوئیں اور پاکستان ٹیلی وژن پر عبدالکریم بلوچ نے انہیں متعارف کرایا۔ پی ٹی وی پر اُن کا پہلا ریکارڈ شدہ گیت مارواڑی زبان کا مشہور کلام "کھڑی نیم کے نیچے، ہوں تو ہی کلی" تھا۔

مائی بھاگی کی شہرت پاکستان کی سرحدوں سے نکل کر بھارت اور دنیا کے دیگر ممالک تک پہنچی۔ اُن کے گائے ہوئے گیت آج بھی اُن کے پروگراموں میں نشر ہوتے ہیں. اُنہوں نے مارواڑی، ڈھاٹکی، گجراتی، ہندی، سرائیکی اور سندھی زبانوں میں ہزاروں لوک گیت گائے۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائی، بھگت کبیر، من ٹھار فقیر اور حمل فقیر جیسے صوفی شعراء کا کلام بھی اپنی آواز میں پیش کیا۔

اُن کی فنی خدمات کے اعتراف میں انہیں تمغۂ حُسنِ کارکردگی، مارئی ایوارڈ، شاہ لطیف ایوارڈ، تھر کوئل ایوارڈ، سچل ایوارڈ سمیت کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ سابق وزیر اعظم شہید ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اُن کی خدمات کے صلے میں انہیں ساٹھ ایکڑ زمین عطا کی تھی۔

زندگی کے آخری برسوں میں مائی بھاگی فالج کے مرض میں مبتلا رہیں۔ بالآخر 7 جولائی 1986ء کو 65 سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُنہیں نئوں کوٹ کے قریب راضی شاہ کے تاریخی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ آج بھی اُن کا نام سندھ کی لوک موسیقی، ثقافت اور صوفیانہ روایت کا روشن استعارہ سمجھا جاتا ہے جبکہ اُن کے فرزند کالو فقیر، بیٹی مائی سونی اور پوتے برکت فقیر نے اُن کے فن کو آگے بڑھایا ہے.

تھر کی موسیقی کا درویش صفت راگی

مراد فقیر

مراد فقیر، سندھ کے اُن عظیم لوک گلوکاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی سادہ مزاجی، روحانی وابستگی اور بے مثال موسیقی کے ذریعے تھر کی ثقافت کو نئی شناخت عطا کی۔ اُن کی پیدائش تھرپارکر کے شہر مٹھی میں خمیسو منگنھار کے گھر ہوئی۔ اُن کا تعلق ایک موسیقار خاندان سے تھا۔ اُن کے دادا جانوا اپنے دور کے معروف راگی تھے۔ مراد فقیر نے کم عمری ہی میں موسیقی سے شغف پیدا کر لیا اور بارہ برس کی عمر میں گھر کے ماحول سے موسیقی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں اُنہوں نے ہارمونیم بجانا سیکھا اور باقاعدہ گائیکی کا آغاز کیا۔

مراد فقیر کی فنی زندگی میں اہم موڑ اُس وقت آیا جب اُنہوں نے خان صاحب خیر محمد خان اور خان صاحب اُمید علی خان سے کلاسیکی موسیقی کی تربیت حاصل کی۔ اُن کی آواز میں مٹھاس، سوز اور

راگوں کی گہری سمجھ موجود تھی۔ تھر کے لوگ اُنہیں ایک ایسے فنکار کے طور پر یاد کرتے ہیں جو ملہار راگ گا کر بارش برسانے اور دیپک راگ کی تاثیر سے خود کو فنا کر دینے کی داستانوں سے وابستہ رہا۔

اُن کی شہرت کا آغاز بھالوا میں منعقد ہونے والے مارئی میلے سے ہوا جہاں اُن کی گائیکی نے سامعین کو مسحور کر دیا۔ اُسی محفل میں ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے پروڈیوسر غلام حسین شیخ اور خواجہ امداد اُن کے فن سے متاثر ہوئے اور اُنہیں ریڈیو پر متعارف کرایا۔ ریڈیو کی بدولت اُن کی آواز سندھ کے کونے کونے تک پہنچی اور وہ عوام میں بے حد مقبول ہو گئے۔

مراد فقیر نے متعدد یادگار گیت گائے تاہم مائی بھاگی کے ساتھ گایا گیا مشہور لوک گیت چرمی انہیں غیر معمولی شہرت دلانے کا سبب بنا۔ مائی بھاگی اُن کی شاگردہ تھیں جبکہ موہن بھگت، بڈھو فقیر، صالورام بھگت اور مصری ڈیپلائی جیسے کئی معروف فنکار بھی اُن کے شاگردوں میں شامل تھے۔

مراد فقیر نہایت درویش صفت، محبت کرنے والے اور مخلص انسان تھے۔ وہ شہرت اور دولت کے بجائے فن اور انسان دوستی کو اہمیت دیتے تھے۔ جو کچھ کماتے، اپنے خاندان اور عزیزوں پر خرچ کر دیتے۔ اُن کی زندگی سادگی، قناعت اور محبت کا عملی نمونہ تھی۔

زندگی کے آخری برسوں میں وہ ذہنی عارضے کا شکار ہو گئے۔ علاج کی بہت کوششیں کی گئیں مگر وہ صحت یاب نہ ہو سکے۔ بالآخر 18 مئی 1977ء کو پچاس سال کی عمر میں یہ عظیم فنکار دنیا سے رخصت ہو گیا۔ آج بھی اُن کا نام تھر کی لوک موسیقی، محبت اور درویشی کی علامت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جبکہ اُن کے پوتے رجب فقیر اُن کے فنی ورثے کو آگے بڑھا رہے ہیں.

سندھ کی لوک موسیقی کا ایک درخشاں باب

موہن بھگت

موہن بھگت سندھ کے نامور لوک گلوکار، صوفی کلام کے راگی اور بھگتی روایت کے ممتاز نمائندہ تھے۔ اُنہوں نے اپنی منفرد گائیکی، روحانی انداز اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کی دلنشین پیشکش کے ذریعے سندھ کی موسیقی میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ بیسویں صدی میں جب بھی شاہ لطیف کے کلام یا تھر کی روایتی موسیقی کا ذکر آتا تھا تو موہن بھگت کا نام احترام سے لیا جاتا تھا۔ اُن کی گائیکی سندھ کی قدیم موسیقی کا ایک ایسا نمونہ تھی جو آج بھی مقبول اور زندہ ہے۔

موہن بھگت تقریباً 1929ء میں ضلع تھرپارکر کے تاریخی شہر اسلام کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا بچپن تھر کے دیہی ماحول میں گزرا جہاں وہ بکریاں چراتے ہوئے صحرا اور جنگلوں میں وقت گزارتے تھے۔ تنہائی کے اِن لمحات میں وہ کافیاں اور لوک گیت گنگناتے رہتے، جس سے اُن کی فطری موسیقی کی صلاحیتیں نکھرتی گئیں۔ موسیقی انہیں ورثے میں ملی تھی، اُن کے والد بھگت اُمیدارام اور چچا موتی بھگت اپنے علاقے کے معروف گلوکار تھے۔ ابتدائی تربیت اُنہوں نے اِنہی دونوں بزرگوں سے حاصل کی۔ بچپن ہی سے موہن بھگت کی آواز اور اندازِ گائیکی لوگوں کی توجہ حاصل کرنے لگا تھا۔ جب وہ مقامی محفلوں میں گاتے تو سامعین اُن کے فن سے بے حد متاثر ہوتے۔ بعد ازاں اُنہوں نے عارفانہ اور صوفیانہ کلام کو بھگتی انداز میں پیش کرنے کی مزید تربیت تھر کے مشہور گلوکار عمرو بھگت اور معروف اُستاد مراد فقیر سے حاصل کی۔ اُستاد مراد فقیر کافی گائیکی کے ممتاز اُستاد تھے اور اُن کے شاگردوں میں سندھ کی عظیم لوک گلوکارہ مائی بھاگی بھی شامل تھیں۔

موہن بھگت کی موسیقی کی ایک خاص پہچان اُن کا سادہ مگر پُراثر سازینہ تھا۔ اُن کے ساتھ گائیکی میں اُن کے بھائی سروپو بھگت اور بعد میں اُن کے صاحبزادے شنکر بھگت شریک ہوتے تھے۔ وہ اپنی محفلوں میں صرف چار ساز استعمال کرتے تھے، ڈھولک، ٹلی، تنبورو اور ہارمونیم۔ اِن سازوں کی ہم آہنگی اور موہن بھگت کی سحر انگیز آواز ایسا ماحول پیدا کرتی تھی کہ سامعین وجد میں آ جاتے تھے.

آج کے دور میں جہاں موسیقی میں بے شمار ساز استعمال ہوتے ہیں، وہاں موہن بھگت نے محدود وسائل کے باوجود ایک منفرد اور دلکش موسیقی روایت قائم رکھی۔

اُن کے تنبورو کی بھی خاص شہرت تھی، جو ایک قدیم درخت کی جڑ سے تیار کیا گیا تھا اور اپنی نوعیت کی ایک نادر مثال سمجھا جاتا تھا۔ موہن بھگت کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے شنکر بھگت اور بھتیجے آتم بھگت نے اُن کی موسیقی کی روایت کو زندہ رکھا اور اسی مخصوص انداز میں گائیکی جاری رکھی.

سندھ کی لوک موسیقی کے اِس عظیم فنکار نے 10 مارچ 1995ء کو دنیا سے رخصت لی، لیکن اُن کی آواز، اُن کا بھگتی انداز اور شاہ لطیف کے کلام کی اُن کی لازوال پیشکش آج بھی موسیقی کے شائقین کے دلوں میں زندہ ہے۔ موہن بھگت کو سندھ کی ثقافتی اور روحانی موسیقی کے ایک اہم ستون کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

تھر کی مٹی سے اٹھنے والی سحر انگیز صدا

صادق فقیر

صادق فقیر سندھ کے ممتاز گلوکاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی دلکش آواز اور منفرد اندازِ گائیکی کے ذریعے نہ صرف سندھ بلکہ پاکستان بھر میں شہرت حاصل کی۔ وہ اُن فنکاروں میں شامل تھے جنہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور جدید سندھی شاعروں میں شیخ ایاز سمیت مختلف شعراکے کلام کو عام لوگوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اُن کی آواز میں تھر کے صحرا کی وسعت، لوک روایت کی سادگی اور صوفیانہ فکر کی گہرائی نمایاں تھی۔

صادق فقیر 20 مارچ 1963ء کو ضلع تھرپارکر کے شہر مٹھی میں فیض محمد منگنھار کے گھر پیدا ہوئے. اُنہوں نے سندھی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور پیشے کے اعتبار سے وہ محکمۂ تعلیم میں اُستاد تھے لیکن موسیقی اُن کا اصل شوق اور پہچان بن گئی۔ بچپن ہی سے اُنہیں گائیکی سے گہرا لگاؤ تھا اور اُنہوں نے موسیقی کی ابتدائی تربیت معروف فنکار حسین فقیر سے حاصل کی۔

اُن کی فنی زندگی کا آغاز 1982ء میں مٹھی کالج کے ایک ثقافتی پروگرام سے ہوا جہاں اُنہوں نے بطور طالب علم اپنی آواز کا جادو جگایا۔ اُن کی صلاحیتوں نے جلد ہی اہلِ فن کی توجہ حاصل کر لی۔ بعد ازاں اُنہیں موسیقی کے میدان میں آگے بڑھنے کا موقع ملا اور وہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے وابستہ ہو گئے۔ معروف براڈکاسٹر نصیر مرزا نے اُنہیں ریڈیو پر متعارف کرایا۔ اسی دوران اُنہوں نے نامور شاعر ایاز گل کی "وائی توکان دھار" ریکارڈ کروائی جو بے حد مقبول ہوئی اور اُن کی شناخت بن گئی۔

1988ء میں اُنہیں پاکستان ٹیلی وژن پر معروف ادیب اور دانشور شمشیر الحیدری نے متعارف کروایا۔ اُس کے بعد صادق فقیر کی شہرت میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ اُنہوں نے نہ صرف لوک گیت بلکہ صوفی شاعری کو بھی اپنی آواز کا حصہ بنایا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، شیخ ایاز، حافظ نظامانی، امداد حسینی، تنویر عباسی، وفا ناتھن شاہی، ایاز گل، ادل سومرو اور سائیں داد ساند جیسے نامور شعراء کے کلام کو اُنہوں نے خوبصورتی سے گایا۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے اُردو کے عظیم شعرء امرزا غالب اور فیض احمد فیض کے کلام کو بھی اپنی آواز میں پیش کیا۔

صادق فقیر صرف گلوکار ہی نہیں بلکہ ادبی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی سرگرم رہے۔ وہ سندھی ادبی سنگت مٹھی شاخ کے بانی اراکین میں شامل تھے اور سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی طرح وہ سگا (سندھ گریجویٹس ایسوسی ایشن) اور سندھ فنکار ویلفیئر ٹرسٹ مٹھی کے ساتھ بھی فعال طور پر وابستہ رہے۔

اُن کے تقریباً پچاس آڈیو البمز ریکارڈ ہوئے اور اُن کے گیت مختلف سندھی ٹی وی چینلز سے نشر ہوتے رہے۔ اُن کی مقبولیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کی آواز آج بھی سندھی موسیقی کے شائقین میں یکساں طور پر پسند کی جاتی ہے۔

26 فروری 2015ء کو صادق فقیر اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لیے گئے ہوئے تھے کہ ایک المناک ٹریفک حادثے میں اُن کا انتقال ہو گیا جبکہ خاندان کے تین افراد شدید زخمی ہوئے۔ اُن کی میت وطن واپس لائی گئی اور مٹھی میں سپردِ خاک کی گئی۔ اُن کے جنازے میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کی یاد میں کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اُن کے دو بیٹے، نزاکت فقیر اور راحت فقیر، آج اپنے والد کے فنی ورثے کو آگے بڑھا رہے ہیں اور سندھ کی موسیقی میں اُن کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

سندھ کی صوفیانہ موسیقی کا ایک معتبر نام

بڈھو فقیر

بڈھو فقیر، سندھ کے معروف لوک گلوکار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ممتاز فنکار تھے جنہوں نے اپنی منفرد آواز اور صوفیانہ گائیکی کے ذریعے عوام میں خاص مقام حاصل کیا۔ اُن کا اصل نام بڈھو فقیر ولد محمد صدیق تھا اور وہ منگنھار برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی پیدائش تقریباً 1942ء میں ضلع تھرپارکر کے شہر مٹھی میں ہوئی۔

بڈھو فقیر کو بچپن ہی سے موسیقی سے گہرا شغف تھا۔ اُنہوں نے صرف پندرہ برس کی عمر میں گائیکی کا آغاز کیا اور موسیقی کی باقاعدہ تربیت معروف اُستاد مراد فقیر سے حاصل کی۔ اپنی محنت، لگن اور فنی صلاحیتوں کے باعث وہ جلد ہی سندھ کے ممتاز گلوکاروں میں شمار ہونے لگے۔

اُنہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، مرتضیٰ ڈاڈاہی، عباس علی شاہ اور حاجی احمد ملاح جیسے عظیم شعرا کے کلام کو اپنی آواز میں پیش کیا۔ اُن کی گائیکی میں صوفیانہ رنگ اور لوک روایت کی خوبصورت جھلک نمایاں تھی۔

بڈھو فقیر کو ریڈیو پر گانے کے متعدد مواقع ملے اور اُن کی کئی ریکارڈنگس آج بھی محفوظ ہیں۔ 1995ء میں اُنہیں کراچی ٹیلی ویژن سے پروگرام کرنے کا موقع ملا جہاں اُنہوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اُن کی خدمات کے اعتراف میں اُنہیں اہم اعزازات بھی دیے گئے۔ سندھ کی موسیقی کا یہ درخشاں ستارہ 3 جون 2005ء کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا مگر اُس کی آواز آج بھی سندھ کی لوک موسیقی میں گونجتی محسوس ہوتی ہے۔

> صحرا کی وسعتوں میں جنم لینے والا یہ فن محبت، امن اور انسان دوستی کا پیغام دیتا ہے۔

بشکریہ پی بی سی مٹھی

Monthly Ahang
pbcaahanghqrs@gmail.com
جولائی 2026ء
21
pbcaahanghqrs@gmail.com

انشائیہ

مہمان

تحریر: ڈاکٹر شازیہ نورین

"مہمان آرہے ہیں" یہ جملہ بار بار ہماری سماعتوں سے ٹکرارہا تھا اور دماغ قلابازیاں کھارہا تھا بلکہ یوں کہیے سوچوں کے گہرے سمندر میں اوندھے منہ غوطے لگارہا تھا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم شاید تنگ نظر، تنگ ذہن اور کنجوس انسان واقع ہوئے ہیں۔ جی نہیں جناب! ہم اپنی تمام تر روایات اور رسم و رواج سے واقف ہیں اور بخوبی جانتے ہیں کہ مہمان کا آنا باعثِ رحمت ہے اور مہمان نوازی ایک اخلاقی فریضہ ہے لیکن کیا کیجیے اِس نگوڑی کمر توڑ مہنگائی نے جہاں جسم و جاں کا رشتہ قائم رکھنا مشکل بنادیا ہے وہیں ہماری اخلاقی اقدار کا بھی تیا پانچا کر دیا ہے۔ ہم لاکھ بُرے میزبان صحیح مگر دوسری جانب مہمانوں کو بھی تو کچھ خیال کرنا چاہیے۔ ہم کون سا اُن کی میزبانی میں مرے جارہے ہیں جو وہ آنا چاہتے ہیں۔ ہم نے خود کو بڑی بے دلی سے تسلی دی۔ چلو جو ہوگا سو ہوگا آنے والا اپنا رزق ساتھ لاتا ہے اور دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام۔

پھر ہم نے سوچا کیوں نہ خود ہی مہمان بن کر کہیں چلے جائیں لیکن اپنے ضمیر کی کڑک دار آواز سُن کر ہم نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ایک تو ہم اپنے ضمیر سے بہت نالاں ہیں ہر وقت، ہر لمحہ بیدار رہتا ہے۔ نجانے وہ کون لوگ ہیں جن کا ضمیر سو جاتا ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتے ہی مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مہمانوں کی آمد جہاں خوشی کا باعث ہوتی ہے وہیں بعض اوقات کبھی نہ بھولنے والی ایک ایسی یادگار بھی بن جاتی ہے جسے جب بھی سوچا جائے انگ انگ میں بجلی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ اکثر گھروں میں یہ بحث زور پکڑنے لگتی ہے کہ چھٹیوں میں دادی کے گھر جایا جائے یا نانی کے گھر۔ خاتونِ خانہ اپنی ساری پلٹون سمیت نانی کے گھر جانے کے لیے تیار کھڑی ہوتی ہے اور اِدھر صاحبِ خانہ کی یہ کوشش ہوتی ہے کسی بھی طرح حفاظتی بند باندھ کر اِس ساری پلٹون کا رُخ دادی کے گھر کی جانب موڑ دیا جائے لیکن صاحب آپ نے وہ کہاوت تو سنی ہوگی "جس کی لاٹھی اسی کی بھینس" تو صاحب قرعہ ہمیشہ نانی کے گھر کا ہی نکالا جاتا ہے اور صاحبِ خانہ بیچارے جان کی امان پاتے ہوئے نانی کے گھر کا رخ کر لیتے ہیں کہ بعد میں دوستوں کو خوامخواہ یہ کہانی بتانی پڑے گی کہ بائیک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا یا پھر سیڑھیوں سے گر گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ باقی آپ خود سمجھدار ہیں، بال بچے دار ہیں۔

مختلف انواع و اقسام کی طرح مہمانوں کی بھی کئی اقسام ہیں۔ مثال کے طور پر نازک مزاج مہمان، نک چڑھے مہمان، غصیلے مہمان، خوامخواہ کے مہمان، بن بلائے مہمان، مان نہ مان میں تیرا مہمان وغیرہ وغیرہ، لیکن اِن تمام اقسام میں سے سب سے زیادہ جن مہمانوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے وہ ہوتے ہیں سسرالی مہمان۔ جی ہاں جناب! سمجھدار حضرات ہمیشہ سسرالی مہمانوں کا خیال اپنی جان سے بھی زیادہ رکھتے ہیں کیونکہ انہیں اپنی "جان" بہت عزیز ہوتی ہے۔ کچھ مہمان تو ایسے بھی ہوتے ہیں جیسے ہی ملنے کے لیے تشریف لاتے ہیں تو دروازے کے باہر سے ہی اعلان فرمادیتے ہیں کہ میاں! ہم آگئے ہیں جو بھی خاطر مدارت کرنا ہے جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچادو ورنہ ہم واپس چلے جائیں گے۔

پرانے وقتوں میں مہمان کی آمد باعثِ رحمت سمجھی جاتی تھی، لوگ مخلصی و بے غرضی سے تعلقات نبھاتے تھے۔ مشکل اوقات میں ایک دوسرے کے کام آیا کرتے تھے۔ تب احسان جتانے کا رواج اِس قدر عام نہ تھا۔ پھر زمانہ بدلہ، مزاج بدلے، حالات بدلے، ضروریاتِ زندگی کے تقاضے بدلے اور پھر ہم سب بدلے۔ پھر مہمان کی آمد بھی ایک بوجھ لگنے لگی اور ہم سب نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بُرے میزبان بن گئے۔ صاحب! مہمان بن کر جانے والوں کو بھی تو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ میزبان کی ہمت و طاقت سے بڑھ کر اُس پر بوجھ نہ ڈالا جائے۔

آپ کا اِس بارے میں کیا خیال ہے؟

یہ سوچتے سوچتے عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ میاں ایسے لوگ آتے کہاں سے ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے ہمارے ہمسائے میں گھر کے بجٹ کو لے کر بحث ہو رہی تھی۔ ہم نے اپنی پُر تجسس فطرت کے تحت کان لگا کر سننے کی کوشش کی تو معلوم ہوا بیگم صاحبہ اِس بات پر جھگڑا فرما رہی ہیں کہ اُن کے شوہرِ نامدار کی کوئی دُور پرے کی چچازاد اُن سے ملنے آئی ہوئی تھیں اور دورانِ قیام گھر کی ہر چیز کا باقاعدہ معائنہ کرتے ہوئے بیگم صاحبہ کے پھوہڑ پن اور اپنے سگھڑاپے پر سیر حاصل گفتگو ارشاد فرماتی رہی ہیں جس کے باعث اُن کے رخصت ہوتے ہی اِن دونوں میاں بیوی میں تیسری عالمی جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔

جناب ہمارا خیال ہے کہ ہر شخص کے رہن سہن کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے جو اُن کے مطابق ٹھیک ہوتا ہے۔ اِس میں خوامخواہ اپنی رائے کا اظہار کرنا اور دوسروں کی دل آزاری کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

اِس لیے جب بھی کسی کے گھر مہمان بن کر جائیں تو مہمان ہی رہیں نہ کہ بلائے جان بن جائیں۔

کیا آپ کا سامنا کبھی ایسے مہمانوں سے ہوا ہے جو مہمان کم اور میزبان زیادہ لگتے ہوں؟ یعنی گھر میں داخل ہوتے ہی پورے گھر میں یوں بلا جھجک دندناتے پھر رہے ہوں جیسے گھر آپ کا نہیں اُن کا ہو۔ جی ہاں! آپ بالکل صحیح سمجھے مہمانوں کے ساتھ آنے والی یہ عجیب و غریب مخلوق سکونِ قلب و ذہن سے نابلد جنہیں ہم مہمان زادے کہتے ہیں اُن کا تہذیب و تمیز سے دُور دُور کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایسا صرف ہمارا خیال ہے آپ اپنے خیالات میں آزاد ہیں کچھ اور بھی سوچ سکتے ہیں کیونکہ صاحب سوچ کو تو پابند نہیں کیا جا سکتا نا؟ چاہے جتنی بھی قدغنیں لگا لی جائیں۔ آپ اپنی سوچ کا دائرہ چاہیں تو جتنا مرضی وسیع رکھیں یا تنگ رکھیں یہ آپ پر منحصر ہے، تو ہم بات کر رہے تھے اُن مہمان زادوں کی جن کی دسترس سے آپ کے گھر کی کوئی چیز بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ چاہے وہ فریج ہو، بچوں کے کھلونے، گھر میں لگے پھول پودے، کراکری کا سامان یا پھر ڈیکوریشن کا سامان، اِس مخلوق کے لمبے ہاتھوں سے کچھ بھی محفوظ نہیں۔ سُنا تھا قانون اپنا راستہ خود بناتا ہے، گھر میں گھسنے والی یہ مخلوق بھی اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ ویسے تو ہم بڑے خوش مزاج واقع ہوئے ہیں۔ مہمانوں کے ساتھی کے بچوں کو بھی بڑی خندہ پیشانی سے خوش آمدید کرتے ہیں لیکن ہماری یہ کیفیت تب عارضی ہو جاتی ہے جب ہماری برداشت کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔ جب کبھی کہیں جائیں تو بچوں کو خاص طور پر سمجھا بجھا کر لے جائیں کہ کسی کے گھر جا کر کس طرح کے طور واطوار کا مظاہرہ کرنا ہے۔ آپ بھی ہماری بات سے اتفاق کریں گے کہ آپ بچوں کو چاہے جتنا بھی زبانی کلامی سمجھا لیں وہ کرتے وہی ہیں جو دیکھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بڑے خود بھی ایسی بات کر جاتے ہیں جس کی اُن سے اُمید نہیں کی جا سکتی۔ بہر حال تمام گفتگو کا لبِ لباب یہ ہے کہ مہمانوں کے ساتھ آئے بچوں پر خاص نظر رکھی جائے۔ مبادہ اُن کی کسی بھی شرارت کے باعث آپ کا کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے اور آپ منہ بسورتے رہ جائیں۔

کچھ مہمان ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آمد کی خبر کے ساتھ ہی نخلستان میں گلاب سے کھل جاتے ہیں۔ چہرہ خوشی سے تمتمانے لگتا ہے، لبوں پر تبسم اور آنکھوں میں چمک سی لہرانے لگتی ہے، دل خوشی سے باغ باغ ہونے لگتا ہے اور روح عجیب سی تال پر رقص کرنے لگتی ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسا آخر کب ہوتا ہے؟ وہ بھی مہمانوں کے آنے پر؟ کس زمانے میں رہتے ہو بھیا؟ آج کل تو کسی سے ملنے جانے سے پہلے اپنے آنے کی خبر نہ دی جائے تو میزبان ایسے غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ اور قصوروار بھی آپ ہی کو ٹھہرایا جاتا ہے کہ بھائی ہم مصروف لوگ ہیں آپ نے آنے سے پہلے خبر کیوں نہ دی، تو کیا آنے والا فارغ الوقت، فارغ الدماغ ہے جو آپ سے ملنے چلا آیا ہے؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ آہستہ آہستہ ہم اپنی تہذیب و تمدن اور اخلاقی روایات و اقدار کو پسِ پشت ڈال کر کسی نئی تہذیب کی داغ بیل ڈال رہے ہیں جس کے مطابق ہم دنیا کے ہر مسئلے سے باخبر ہیں لیکن ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے اپنوں کے احساسات و جذبات سے بے خبر ہیں۔ اپنے اِرد گرد رہنے والے دوستوں احباب اور رشتہ داروں سب سے اَن دیکھی دوری بنا رہے ہیں۔ ہر شخص اپنی ذات کے حصار میں قید ہوتا جا رہا ہے۔ اِس قیدِ تنہائی میں اندر ہی اندر مرتا جا رہا ہے۔ کہیں ہم زمانے کی دوڑ میں خود کو خود سے الگ تو نہیں کرتے جا رہے۔ اپنی ذات کی عمیق گہرائیوں میں کھونے سے پہلے ہوش میں آ جایئے اور اپنے پرانے دوستوں سے رابطے استوار کیجئے، روٹھے ہوؤں کو منا لیجئے اور جو آپ سے دُور جا رہے ہیں انہیں واپس بلا لیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت کا پہیہ گھوم جائے اور پھر کچھ بھی واپس نہ آ پائے۔ بہت نہیں تو مہینے میں ایک دعوت تو اپنوں کی ہونی ہی چاہیے۔ ایک ایسا وقت جس میں سب ایک ساتھ بیٹھ سکیں، اپنا اپنا دل کھول سکیں، انا اور غلط فہمیوں کی چادر ہٹا کر ایک دوسرے کی اُمیدوں اور توقعات کو سمجھ سکیں۔ ایک دوسرے سے دل کی بات کہہ سکیں۔ کیا وقت کی اِس تیز رفتاری میں ایسا ممکن ہے کہ ہم خود کو کھونے سے پہلے ڈھونڈ لیں؟

بشکریہ پی بی سی بہاولپور

جواب کے سوال

علی تنہا

مبین نے اپنی بڑی بہن بشریٰ کے لمبے سیاہ بال دیکھ کر کہا: "بہن لمبے بالوں کا اب فیشن نہیں رہا تم بیوٹی پالر جا کے یہ بال کٹوادو"۔

"تم اپنی عمر سے زیادہ باتیں نہ کیا کرو میں جواب تمہیں ضرور دیتی لیکن میں زیادہ بول نہیں سکتی"۔ بشریٰ نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

چھوٹے مبین کے دل پر بہن کی بات سن کر گھونسا لگا۔ وہ درماندہ ہو کر کچھ دیر چھت کو دیکھتا رہا۔

بشریٰ نے بھائی کی خاموشی کو سمجھ لیا اِس لیے دوبارہ بولی "میں نے کہا نا تم اپنی بات پھر سے کہو"۔

"میں اپنی عمر سے آگے کی باتیں اب نہیں کروں گا" مبین تھوڑی دیر رُکا اور پھر کچھ باتیں آہستہ سے کیں۔ لیکن مبین نے جو پوچھنا چاہا وہ بشریٰ نے سنا ضرور لیکن جواب جو دیا وہ مبین نے پوچھا ہی نہیں تھا۔

"بشریٰ کیا تمہارے کان بج رہے ہیں میں کہتا کچھ ہوں تم سنتی کچھ اور ہو"۔ بشریٰ نے مسکرا کے جواب دیا "تمہارے خیال میں میرے کان میں وائلن یا گٹار ہیں جو بجتے رہتے ہیں"۔ مبین نے بڑی بہن کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا اور جواب نہ دیا۔ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گیا۔

بشریٰ مبین سے آٹھ برس بڑی ہے۔ اُس کی شربتی آنکھوں میں جو سوال تھے وہ ایک ایک کر کے جواب کی صورت میں کمرے کی دیواروں پر لکھے ہوئے نظر آنے لگے ہیں۔ اگرچہ بشریٰ کے لمبے گھنے بال کمرے کے چاروں طرف پھیل گئے ہیں اور اُن میں پھنسے ہوئے جواب اُن میں منہ چھپائے ہوئے ہیں لیکن اتنے واضح حروف آخر کب تک سیاہ ریشمی بال چھپا سکتے ہیں۔

بشریٰ کو ڈیڑھ برس پہلے تشخیص کے بعد ڈاکٹر نے جب بتایا کہ اُس کے دل میں سوراخ ہے اور آپریشن ضروری ہے تو اُس کے ماں باپ اور تین دوسرے بہن بھائیوں کے دل بھی سوراخوں سے بھر گئے۔ بشریٰ کے باپ علاؤدین جس فرم میں ملازم تھے اب وہ تیل کے بحران کی وجہ سے دیوالیہ ہونے کو ہے۔ اِس صورتحال میں علاؤدین کے لیے سات لاکھ 80 ہزار کی رقم آپریشن کے لیے مہیا کرنا ایک ڈراؤنا خواب بن گیا ہے۔ وہ جانتا ہے اِس گھر میں خواب ہی خواب پلتے ہیں جن کی تعبیریں ہمیشہ ہولناک رہی ہیں۔ علاؤدین نے اپنے بڑے بیٹے یامین سے بار بار اتنی بڑی رقم پیدا کرنے کے اسباب کے متعلق جب بھی پوچھا ہے اُس کے سینے کے سوراخ سے خون رسنے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علاؤدین کی بیوی اپنے خاوند سے لڑتی رہتی ہے کہ بچوں کے زخم ہرے نہ کرے۔ یامین کی ماں جندن بڑے حوصلے والی خاتون ہے۔

اِسی لیے وہ گھر کے سیاہ روح خوابوں کو محو کرنے کی ہر وقت تدبیر کرتی رہتی ہے۔ اِس عمل میں، جب چاروں طرف تیل کے بحران نے مخلوق کی نیندوں کو اُڑانا شروع کر دیا ہے جندن بہت خوش ہے۔ اب اِس بے خوابی کی وجہ سے خوابوں کے بھوت بھاگ جائیں گے۔

یامین گھر سے باہر نکل آیا۔ یہ نکلتے ساون کا حبس زدہ دن تھا۔ وہ پسینے میں شرابور اپنے مرشد کلیم شاہ کے ہاں دل کے سکون کے لیے سننے سُنانے کو جا رہا تھا۔ اُسے یاد آیا آج منگل ہے اور کلیم شاہ اِس دن کسی سے ملتا نہیں۔ اِسی لیے ناچار گھر لوٹ آیا اور آتے ہی ٹی وی آن کر کے جو دیکھا تو اسکرین پر شیطان کھڑا ہاتھ میں گرز لیے، بڑھکیں مار رہا ہے۔

اور کچھ دیر تک شیطان کے مُنہ سے شعلے نکلتے دیکھا کیا وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اُس سے قیامت کے آثار دیکھ کے چھوٹے مبین اور بشریٰ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوال کیا:

"یہ اِس اژدھا، کیا کہہ رہا ہے"۔

"اِس اژدھے کی ایک ہی زبان ہوتی ہے یامین بھائی اور وہ ہے زہر اور زہر آگ ہے"۔

بشریٰ صوفے پر ٹیک لگائے شیطان اور اژدھے کے فرق کے بارے میں سوچتی رہی،

"تم کیا دیکھ کے خاموش ہو گئی؟

بشریٰ نے یامین کے سوال پر غور کیا اور پولے پولے لفظوں میں کہا۔

"اسکرین پر دیکھ رہے ہو آگ کا سرخ جہنم"

ہاں بہن دیکھو یہ کیا عجب ہے کہ میرے باپ کی ابتدائی عمر میں سُرخ رنگ اُمید کا اُبھرا تھا اور آج یہ خون اور آگ میں بدل گیا ہے۔ یہ رنگ بھی بازی گر ہیں کیا کیا کرتب دکھاتے ہیں"۔

"اور ہاں ایسا ہی ہے" بشریٰ نے بیزاری سے جواب دیا۔

علاؤدین بچوں کو ساتھ والے کمرے میں دیکھ کر اندر آ گیا۔ اسے لگا پورا کمرہ سُرخ رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ وہ حیران کچھ دیر تک تینوں بچوں کو گھور گھور کر تکتا رہا۔ سوچا کیا وہ پوچھے یہ کمرے کا رنگ دیکھتے ہی دیکھتے کس نے پینٹ کر دیا ہے۔ لیکن بشریٰ کے بجھے ہوئے رخساروں سے رخصت ہوتی سُرخی دیکھ کے چپ سادھ گیا۔ اُس کے چہرے پر کہیں کہیں سبز رنگ دیکھ کے اُسے یاد آیا کہ سُرخ اور سبز رنگ کی جنگ میں بھی تیل کے جلنے سے بھسم ہوتی دنیا کو کس طرح خاکستر کیا تھا۔

"تو کیا دنیا رنگوں میں جی رہی ہے؟"

علاؤدین نے بشریٰ کے پہلو میں بیٹھ کے اُداس لہجے میں پوچھا لیکن کسی نے جواب نہ دیا کچھ دیر کے بعد یامین نے باپ کو پریشان پا کے سوال کیا"

"بڑے دھوکے باز ہیں۔ یہ نہ ہوں تو دنیا نظر کیسے آئے۔ یہ رنگ ہی ہیں جو شعلے دکھا رہے ہیں کیا ایسا نہیں ہے؟

"یار یامین، ہم نے زندگی بھر ایسی باتیں نہیں کی تو کیا ہر زمانے کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے"

کچھ دیر کے بعد بشریٰ نے خاموشی توڑ کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ کیا ہے بے سروپا باتیں ہیں۔ اگرچہ ماں نے مجھے منع کیا ہے کہ دوسروں کو خبر نہ ہونے دوں لیکن میں حد سے زیادہ پریشان ہوں"۔

"پریشان کس لیے، ضرور سنائو ماں کی ہر بات ماننے کے لیے تھوڑی ہوتی ہے"۔

"ہاں تو بابا تین راتیں گزریں، میں نے دیکھا سپہر ہے اور آسمان کونجوں سے بھرتا جا رہا ہے۔ کونجیں مشرق میں چلاتی ہوئی آ رہی ہیں جیسے فریادی ہوں کہ انہیں بچایا جائے۔ میں حیرت میں ڈوبی کونجوں کو تکتی رہی لیکن تھوڑی ہی دیر میں کونجوں کی فریاد کا راز کھل گیا۔ میں دیکھتی کیا ہوں آسمان سے بجلی کی رفتار میں ایک باز نیچے اُتر رہا ہے اور کونجیں اِس ظالم باز کو دیکھتے ہی دیکھتے قطار توڑ رہی ہیں۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں باز نے جھپٹ کر ایک کونج کو پنجوں میں دُبک لیا اور ہمارے صحن کے اوپر فضا میں کونج کا پیٹ چاک کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے خون کی دھاریں ہمارے صحن میں گرنے لگیں۔ گھبرا کے میں نے اپنی امی کو پکارا اور وہ آتے ہکا بکا باز کو کونج کے پنجوں میں دبائے دیکھا۔ اتنے میں مغرب سے ایک اور باز کونجوں پر لپکا مگر مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میں نے آنکھیں دونوں ہاتھوں میں ڈھانپ لیں۔" بشریٰ نے کمرے میں موت کی سی خاموشی کو توڑتے ہوئے سب کو دیکھا اور اپنے باپ علاؤالدین سے پوچھا:

"بابا آپ پریشان ہو گئے کیا یہ خواب میری طرف اشارہ کرتا ہے؟" علاؤالدین بیٹی کے سوال پر کانپ اُٹھا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولا "بشریٰ بیٹی خوابوں کا کیا ہے بھلا آپ کی طرف اشارہ کیسے ہو گیا؟"

"تو بابا یہی خواب آپ کو کیوں نہ دکھایا گیا؟" علاؤالدین نے سب کی جانب دیکھا جیسے پوچھتا ہو اِس کی تعبیر بتائے یا چپ رہے۔ سوچا یہ مقام خاموشی کا ہے۔ اگر سچ کہتا ہے تو اُس سے جو سوال اُبھرے گا وہ اُسے کہاں رکھے گا؟

"اور بابا آپ کن خیالوں میں کھو گئے؟" علاؤدین نے جونہی جواب کے لیے منہ کھولا۔ اُس کے جواب سے پورا گھر بھر گیا۔ اُس نے سب سے پوچھنا چاہا کہ اب کسی کے لیے اِس گھر میں کوئی جگہ رہ گئی ہے مگر جواب کے ایوان میں وہ سوال ہی بھول گئے۔

بشکریہ پی بی سی راولپنڈی

پاکستان میں اُردو خاکہ نگاری کی منزلیں

تحریر: محمد رمضان (شاہد حنائی)

کسی نے کیا سچ لکھا ہے: "ادب کا بنیادی سروکار انسان کو سمجھنا ہے" اور ممتاز مفتی نے کہا ہے کہ "انسانی شخصیت تہ در تہ ڈھکا چھپا سلسلہ ہے، پورے طور پر اِس کا اظہار ممکن نہیں۔" ادب کو مختلف شعری و نثری اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے تاکہ ہر تحریر کی باضابطہ شناخت اور تعارف و تفہیم میں آسانی رہے۔ اِس درجہ بندی میں ایک خانہ خاکہ نگاری کے عنوان سے وقف کیا گیا۔ خاکہ نگاری کے باب میں پہلا نام مولانا محمد حسین آزاد کا ملتا ہے لیکن خاکہ نگاری کی صنف کو باقاعدہ رواج مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد خاکے لکھنے والوں نے دیا جنھوں نے سینکڑوں خاکے لکھے جو مجالس میں پڑھے گئے اور کُتب و رسائل میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئے۔

ایک مکمل خاکے کی حتمی تعریف کیا ہے؟ یہ سوال ہنوز جواب طلب ہے۔ اگرچہ خاکہ نگاری کے حوالے سے معقول تعداد میں مضامین اور درجن بھر مقالے لکھے جا چکے ہیں، چند ایک کتابیں بھی اشاعت ہو چکی ہیں۔ خاکہ نگاری کے موضوع اور خاکہ نگاری یا خاکہ نگاروں کے حوالے سے برصغیر کی مختلف درس گاہوں میں مختلف ڈگریوں کے لیے تحقیقی کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ تقسیمِ برصغیر کے بعد پاکستان میں خاکہ نگاری کے ہزار سے زائد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، محمد طفیل، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو وغیرہ خاکہ نگاری کے حوالے سے خوب مقبول ہوئے۔ اِن تمام خوش کن صداقتوں کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ ابھی تک خاکے کی صنف کو جامع تعریف میسر نہیں آ سکی۔ اگرچہ کئی اکابر نے مختلف فارمولے تجویز کیے، کئی سانچے گھڑے مگر اُن کے باہمی اختلافِ رائے اور تضاد بیانی کی وجہ سے صنفِ خاکہ نگاری ایسا خالی میدان بن کر رہ گئی ہے جہاں کوئی بھی اپنا شخصی مضمون، تبصرہ، تعریفی بیاں اور تعزیت نامہ خاکہ کہہ کر قبضہ کر سکتا ہے۔ یادیں، آپ بیتی اور سوانح عمریاں لکھنے والوں نے بھی یہی زیادتی کی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا خاکہ نگاری کو "کارگہِ شیشہ گراں" کہتے ہیں۔ دیگر ناقدین اور محققین کے نزدیک خاکہ کیا ہے؟ چند ایک کی مختصر آراء سے فن کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

محترمہ آمنہ صدیقی کے بقول:

"سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں، اُن میں سے ایک شخصی خاکہ ہے۔
یہ دراصل مضمون نگاری کی ایک قسم ہے جس میں کسی شخصیت کے اُن نقوش کو اُجاگر کیا جاتا ہے، جن کے امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ شخصی خاکہ کسی فرد کی مکمل داستانِ حیات نہیں ہوتا بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے، اِس میں تفصیل سے زیادہ ابہام ہوتا ہے اور ایسے اشارے کیے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"مصوری کی اصطلاح میں بات کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ سوانح مضمون نگاری پورٹریٹ ہے جب کہ خاکہ پنسل سکیچ ہے۔ جس میں کم سے کم لائنوں میں چہرے کا تاثر واضح کیا جاتا ہے۔ اب یہ مصور کا اپنا وجدان اور فنی شعور ہے کہ وہ تاثر کو اُبھارنے کے لیے چہرے کے کن خطوط کو نمایاں کرتا ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں:

"بات دراصل یہ ہے کہ خاکہ ایک ایسی صنف ہے جس کا خام مواد کسی دوسری شخصیت کے ماخذ و مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے لیکن ایک عمدہ خاکہ اِس خام مواد کو من و عن پیش نہیں کرتا بلکہ مختلف واقعات کو مشاہدہ بین کے تاثر اور تجربے کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہی وہ مشکل مرحلہ ہے جہاں مصنف کے تخلیقی جوہر سے مسِ خام یا تو کندن بن جاتا ہے یا راکھ۔"

افتخار اجمل شاہین کے خیال میں:

"خاکہ وہ مختصر مضمون ہے جس میں خاکہ نگار اپنے مطلوبہ خاکہ (شخصیت) کے تمام خدوخال نمایاں کرتا ہے بلکہ مخصوص الفاظ میں اِس شخصیت کے اُنہی خدوخال کی تصویر پیش کرتا ہے جس سے اُس کے مخصوص اور مطلوبہ، ظاہری اور باطنی نقوش مؤثر انداز میں اُبھر کر سامنے آ جائیں۔"

ڈاکٹر سیّد وقار احمد رضوی ایک جگہ رقم طراز ہیں:

"خاکہ نگاری بظاہر آسان مگر مشکل صنفِ ادب ہے جس میں مدح سرائی کے بجائے کسی شخصیت کا خاکہ تحریر کیا جاتا ہے جس سے اِس کی سیرت و کردار کے اہم پہلو اُجاگر ہو کر سامنے آ جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خاکہ نگاری ایک فن ہے مرقع سازی اور شخصیت کی ترجمانی کا۔ اگر خاکہ مکمل ہو تو شخصیت زندہ ہو جاتی ہے۔ اُس میں افراط و تفریط، غلو، مدحت طرازی سے کام نہیں لیا جاتا ہے بلکہ جو شخصیت جیسی ہے من و عن اُس کو اُسی طرح ادبی پیرائے میں بیان کر دیا جاتا ہے تاکہ شخصیت کے خدوخال اُبھر کر سامنے آ جائیں۔

یہ خاکہ نگار کا کمال ہے کہ وہ شخصیت کی پوری طرح عکاسی کر سکے۔ پھر اگر خاکہ نگار زبان و بیان کی قدرت، سحر آفرینی اور جادو بیانی رکھتا ہو تو یہ بات سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔"

خاکہ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر بشیر سیفی واحد نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں:

"اچھے خاکے کی ایک خوبی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اِس میں شخصیت کے روشن و تاریک دونوں پہلوؤں کی جھلک دکھائی جائے ورنہ پیش کردہ قلمی تصویر یک رُخی قرار پائے گی۔ کیونکہ انسان نہ اچھائیوں کا مرقع ہے نہ برائیوں کا۔ ہر انسان میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں اور خامیوں کے ساتھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخصیت کو اس کی ساری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کرے۔ محض خوبیوں کے بیان سے خاکہ مدحیہ مضمون بن جائے گا اور صرف خامیوں کے اظہار سے دشنام طرازی کی حدود میں داخل ہو جائے گا۔ اِس حوالے سے دیکھا جائے تو خاکہ نگاری ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ خاکہ نگار کو کمال درجے کا ادیب ہونا چاہیے۔"

احمد ندیم قاسمی کی رائے یہ ہے:

"شخصیت نویسی یا خاکہ نگاری کی صنف کو گزشتہ نصف صدی کے عرصے میں کئی اساتذہ نے برتا ہے۔ اُن میں سے ہر ادیب کا اسلوبِ نگارش خاص اُس کا اپنا ہے مگر مقصد سبھی کا یہ ہوتا ہے کہ جس شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے اُس کے چہرے کے علاوہ اُس کے مزاج کے خدوخال بھی واضح ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آ جائیں اور جب وہ خاکہ پڑھ لے تو محسوس کرے کہ وہ اِس شخصیت سے نہ صرف متعارف ہے بلکہ اِس کے ساتھ اُس کے قریبی مراسم ہیں۔"

ڈاکٹر احسن فاروقی:

خاکہ نگاری صراطِ مستقیم ہے، جو بال سے زیادہ باریک اور تیغ سے زیادہ تیز ہے۔"

محمد طفیل:

"خاکہ نگاری خدائی حدود میں قدم رکھنے کے مترادف ہے۔ یعنی جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہو اُس کے عین مین اظہار کا نام خاکہ نگاری ہے۔"

معین الدین:

"خاکہ نگاری میں تاریخی واقفیت سے زیادہ شخصی تاثر کی دھوپ چھاؤں کو سیر کرنا پڑتا ہے۔"

نثار احمد فاروقی:

خاکہ نگاری تنقید یا تنقیص کے برعکس شخصیت کی عکاسی کا نام ہے۔"

مجھے احساس ہے کہ درجن بھر محترمین کے خیالات نقل کرنے سے مضمون بے جا طوالت کا شکار ہو گا مگر مجھے اپنا مدعا واضح کرنے کے لیے ایسا ہی ضروری تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ درجن بھر نامور اکابرین کے فرمودات میں کہیں بھی صنفِ خاکہ نگاری کے لیے کوئی مخصوص فریم تجویز نہیں کیا گیا۔ تو کیا خاکہ ہر قسم کے قواعد و ضوابط سے آزاد صنف ہے؟ میں غزل کی بات نہیں کرتا کہ اُس کی جڑیں صدیوں تک پھیلی ہوئی ہیں اور اُس کی آبیاری میں کئی نسلیں ہمہ وقت مصروف رہی ہیں۔ مگر نثری نظم، آزاد غزل، انشائیہ، ہائیکو اور اب اُردو ماہیا کے متعلق کس تواتر اور شدت کے ساتھ بحثیں ہو رہی ہیں، مضامین اور کتابیں تحریر کی جا رہی ہیں، مؤقر جرائد اِن اصناف کے گوشے اور خاص نمبر نکال رہے ہیں مگر خاکہ نگاری سے بے نیازی کا عالم گزشتہ سطور میں عرض کر چکا ہوں۔

پاکستان میں خاکہ نگاری کے حوالے سے صرف دو کتابیں سامنے آئی ہیں۔ اِس سلسلے کی پہلی کتاب بہ عنوان خاکہ نگاری (فن و تنقید) لکھنے کا اعزاز ڈاکٹر بشیر سیفی کو حاصل ہوا۔ ڈاکٹر بشیر سیفی نے برسوں کی محنت اور اُردو خاکے کے تفصیلی مطالعے کے بعد اپنی کتاب پیش کی۔ اگرچہ اُن کی کتاب "خاکہ نگاری۔ فن و تنقید" باقاعدہ تنقیدی زاویے سے نہیں لکھی گئی مگر پھر بھی اِس کتاب کو ابتدائی قاعدے کی حیثیت حاصل رہے گی۔ اب تک مذکورہ کتاب کے غالباً تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ صاحبِ کتاب نے ۱۹۸۵ء تک والے خاکوں کے مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔

اگرچہ کوئی بھی جائزہ حتمی نہیں ہوتا پھر بھی میں یقین سے کہتا ہوں کہ بشیر سیفی صاحب نے اپنی حد تک حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

گزشتہ تین دہائیوں کے دوران مجھے اُردو خاکے سے خصوصی لگاؤ رہا ہے اور خاکوں کے مجموعے اور خاکہ نگاری کے متعلق لکھی جانے والی تحریریں میری تلاش رہی ہیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ متعدد اہم کُتب ڈاکٹر بشیر سیفی کی تحقیق یا جائزے میں شامل نہ ہو سکیں۔ یقیناً اِس کی واحد وجہ مصنف کی مذکورہ کُتب تک عدم رسائی ہی ہو گی ورنہ اُن کی نیت یا قابلیت پر شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جناب بشیر سیفی کے بعد پروفیسر شجاع احمد زیبا کا ایک کتابچہ بہ عنوان "اُردو کے قلمی خاکے" سال 1993ء میں شائع ہوا۔ یہ کتابچہ دراصل شجاع احمد زیبا صاحب کا ایم اے فائنل کا ایک اختیاری پرچہ ہے جو اُنہوں نے 1947ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں دورانِ تعلیم لکھا تھا۔ صنف خاکہ نگاری کے حوالے سے لکھا گیا یہ پرچہ قریباً نصف صدی کے بعد زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ "اُردو میں قلمی خاکے" بنیادی طور پر ایک طالب علم کی نصابی کاوش ہے، جو نصف صدی گزرنے کے بعد قارئین کے سامنے آئی ہے۔ اِس پرچے میں شجاع احمد زیبا نے خاکے کے ارتقائی مطالعہ کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ ، چند ہم عصر، مردم دیدہ، گنج ہائے گراں مایہ، شیش محل پر رائے زنی کی ہے۔ مصنف نے اِن خاکہ نگار یا خاکوں کو بھی ناقد کی بجائے طالب علم کی نظر سے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر بشیر سیفی کے بعد قدرت اللہ شہزاد نے صنفِ خاکہ نگاری پر خصوصی توجہ دی۔ وہ نہ صرف خود خاکہ نگار ہیں بلکہ گاہے بہ گاہے خاکہ نگاروں/خاکہ نگاری کے مجموعوں پر تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ وہ مستقل مزاجی اور دل جمعی کے ساتھ اُردو خاکہ نگاری کے منظر نامے اور رجحانات پر بحث کرتے رہتے ہیں۔ خاکہ نگاری کے حوالے سے اُن کے مطبوعہ مضامین کا مجموعہ "اُردو کے چند خاکہ نگار" اشاعت ہو چکا ہے۔ میرے قیاس کے مطابق کتابی صورت میں خاکہ نگاری کے تنقیدی مضامین کی یہ واحد مثال ہے۔

بعد ازاں اِسی سلسلے کی راقم (شاہد حنائی) کی ضخیم کتاب بہ عنوان "اُردو خاکہ نگاری۔ فن ۔تاریخ ۔ تجزیہ" ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب میں انیتس اہم مضامین اور صنفِ خاکہ نگاری کی مطبوعہ کتب کا اشاریہ شامل ہے۔ اِس کتاب میں اُردو خاکے کی ابتدائی تاریخ ،اقسام، ارتقائ، رجحانات، اختلافات، امکانات پر تفصیلی مواد شامل ہے۔ نیز کتاب میں شامل اشاریہ اپنی جگہ خاصے کی چیز ہے۔

محمد حسین جامی کی کتاب "اُردو خاکہ نگاری" ایک اچھی کوشش ہے۔ اِس کتاب میں صنف خاکہ نگاری پر نصابی نوعیت کی بحث کی گئی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تقسیم کے بعد برصغیر میں خاکہ کثرت سے لکھا گیا۔ اِن خاکوں کا ادبی و فنی معیار کیا تھا یا ہے؟ مجھے امرتا پریتم کی لکھی ہوئی چند سطریں یاد آ رہی ہیں: "پتھروں کے کوئلوں کا دھواں یوں تو برسوں سے ادبی ماحول کی ہوا میں تھا لیکن ملک کی آزادی کے ساتھ جوں جوں ذکر کے مواقع بڑھے، ناموں کو سنُا سُنایا جانے لگا توں توں مواقع پانے کی کھینچا تانی میں یہ پتھر کے کوئلوں کا دھواں بہت گاڑھا ہوتا گیا اور پھر اُس میں سے تصانیف کی سرخ مہک نکلنے کی بجائے عداوتوں کی چنگاریاں اُڑنے لگیں اور کئی ایک صفحات نجی ثناخوانی سے پُر کیے جانے لگے۔"

میں سمجھتا ہوں تقسیم کے بعد خاکہ نگاری کو ایک ادبی صنف کی بجائے ذاتی فن کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ لکھنے والوں نے خوشامدانہ مضامین اور نثری قصیدوں کو خاکہ نگاری کے خانے میں ڈال دیا۔ بلاشبہ تمام خاکہ نگاروں پر یہ الزام درست ثابت نہیں ہوتا مگر بڑی حد تک سچ یہی ہے کہ ہمارے ہمارے ہاں خاکہ تعریف کے طور پر ہی برتا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چاپلوسی مزاج قلم کار خاکہ نگار بن بیٹھا ہے۔ جو شخص شاعری کے اسرار و رموز سے ناآشنا ہے یا افسانہ لکھنے سے قاصر ہے، وہ خاکے لکھ کر سرکردہ ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔

در حقیقت اگر ہر شخص اچھا خاکہ لکھ سکتا اور ہر شخص کا اچھا خاکہ لکھا جا سکتا تو محمد طفیل صاحب کو یہ لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی!: "بھائی! میں نیاز صاحب کی تحریر کا تو عاشق ہوں مگر شخصیت کا نہیں، بالکل نہیں۔اِس لیے اب بھی سوچ لیجیے کہ مجھ سے کچھ لکھوانا مناسب بھی ہوگا یا نہیں!" اورمزید لکھا: نیاز صاحب کے بارے میں میری معلومات ناقص نہ سہی محدود ضرور ہیں۔اِتنی مختصر یادوں کے سہارے مجھ سے اتنی بڑی شخصیت کا جھٹکانہ کرائیں۔"

اگر محمد طفیل جیسا باکمال خاکہ نگار علامہ نیاز فتح پوری کے سلسلے میں یوں تردّد کرتا ہے تو سوچیے کہ خاکہ لکھنے کے لیے ایک خاکہ نگار میں کیا کیا صلاحیتیں اور خوبیاں ہونا چاہیئں! یہ جاننے کی کسی نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ یا پھر ایک عام قلم کار اور خاکہ نگار میں کیا فرق ہوتا ہے! آخر کچھ ہوتا تو ہے جو ایک اچھے خاکہ نگار کو ایک عام مضمون نگار سے ممتاز کرتا ہے۔اِسی ضمن میں چند معتبر مصنفین کی آراء پیش کرنا چاہوں گا۔

پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

خاکہ نگار کا رویہ موضوع بننے والی شخصیت کی طرف سوانح نگار کے رویے سے اِس معاملے میں مختلف ہوتا ہے کہ اِس کی توجہ تصویر کے چند نمایاں نقطوں پر مرکوز رہتی ہے، وہ نہ تو اُس شخصیت سے منسوب ہر واقعے کی تفصیل میں جاتا ہے نہ شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔اُس کی نظر انتخابی ہوتی ہے۔وہ جہاں تہاں سے چند واقعات، شخصیات کے چند پہلوؤں سوچیے تک اپنے آپ کو محدود کرلیتا ہے اور اُنہی واقعات و پہلوؤں کی مدد سے ایسی تصویر بناتا ہے جو ادھوری نہ لگے۔ خاکہ نگار ایک چابک دست مصور ہوتا ہے جو گنتی کی چند لکیروں یا برش کے چند سٹروکس کے وسیلے سے جامع اور ہمہ گیر اور متحرک تصویر لفظوں میں اُتار دیتا ہے۔ کسی شخصیت کے ایسے عناصر جو مرکزی حوالوں کی حیثیت رکھتے ہوں یا اُس سے وابستہ ایسے واقعات جن سے شخصیت کے بھید ہوں۔ خاکہ نگار کا بنیادی سروکار انہی سے ہوتا ہے۔"

جوگندر پال کہتے ہیں:

اچھا خاکہ نگار بے صبری سے کام نہیں لیتا اور کسی شخصیت کی ہمہ پہلوی شکل پیش کرنے کی بجائے اسے پہلو بہ پہلو پیش کرتا ہے، جیسے ایک پوز...! یہ اور...! اب ایک یہ...! اور یوں وہ مکمل شخصیت قابلِ یقین ہو کر اپنی طرف متوجہ کرنے لگتی ہے۔"

مجنوں گورکھ پوری سمجھتے ہیں:

خاکہ نگار کے لیے تجسس اور دریاب ہونا ضروری ہے۔"

پچھلے تیس چالیس برسوں سے پاکستان میں تقریباتی خاکہ فروغ پا رہا ہے۔یعنی کسی ادیب کی کتاب کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر خاکہ بھی لازمی آئٹم سمجھا جانے لگا ہے۔اِن مضامین نما خاکوں کی بڑی تعداد فرمائش پر لکھی جاتی ہے۔ کسی ادیب کے ساتھ شام یا جشن کے موقع پر پڑھے جانے والے خاکے بھی دراصل تعریفی مضامین ہی ہوتے ہیں۔ قد آور ادیبوں کی سال گرہ یا برسی منانے کا سلسلہ بھی چل نکلا ہے۔اِن تقریباتی خاکوں میں محبت اور ذاتی تعلق کا عنصر نمایاں بلکہ حاوی ہوتا ہے۔ خاکہ نگار خاکہ نگاری کی جزئیات سے بے خبر ہوتا ہے یا پھر دانستہ گریز برتتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے خاکوں/ شخصی مضامین میں اپنے منصب سے اُتر کر مداح کی سطح پر آجاتا ہے۔

میں اور آپ ہزار بار دیکھ چکے ہیں کہ کسی شاعر ادیب کے انتقال یا برسی پر ہونے والے تعزیتی پروگرام میں کس طرح مرحوم کو بہترین انسانی اوصاف اور اعلیٰ کردار کا نمونہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہی روش تعریفی مضامین میں اختیار کی جاتی ہے جن میں چند یادیں اور واقعات شامل کر لیے جاتے ہیں۔ بعد میں یہی مضامین خاکوں کے مجموعوں میں شامل ہوتے ہیں۔ مرحوم شخصیت سے عقیدت و محبت اور تعلقِ خاطر اپنی جگہ مگر تعزیتی مضامین خاکہ نگاری سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔ تاہم بعض خاکہ نگاروں نے تقریبات کے لیے بھی بھرپور خاکے لکھے ہیں۔اِن خاکہ نگاروں میں ممتاز مفتی، عطاء الحق قاسمی، مشتاق احمد یوسفی، ایس ایم معین قریشی، محمد خالد اختر، ڈاکٹر محمد یونس بٹ، ڈاکٹر حسن رضوی کے نام شامل ہیں۔

گزشتہ دو دہائیوں کے دوران کتاب اور صاحبِ کتاب کے متعلق مِلا جُلا تاثر بھی خاکہ سمجھ لیا گیا ہے۔ ایسی تحریروں میں صاحبِ کتاب کے چند اوصاف اور کتاب کی چند خوبیاں گنوا کر خاکہ نما مکمل کر لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اِس طرز پر لکھنے والوں نے اچھی تحریریں بھی لکھی ہیں لیکن اِس کے باوجود اُن تحریروں کو مکمل شخصی خاکے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اِن تحریروں کے بعض حصے خاکہ نگاری سے تعلق ضرور رکھتے ہیں۔ منظر علی خان منظر، ڈاکٹر خیال امروہوی، اظہر سلیم مجوکہ اور مشہود حسن رضوی کے تحریر کردہ ایسے مضامین کی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔

یادوں، قریبی تعلقات اور ذاتی وابستگیوں کی بناء پر اے حمید، ممتاز احمد خان، سیّد انیس شاہ جیلانی، امراؤ طارق، ڈاکٹر آفتاب احمد خان، عبدالقوی ضیا علیگ نے خاکوں کے مجموعے مکمل کیے اور بڑی حد تک خاکہ نگاری کے مروجہ اصولوں کے تحت اچھے خاکے لکھے۔

بہ ظاہر صنفِ خاکہ نگاری پر مرد حضرات کی اجارہ داری دکھائی دیتی ہے مگر اتفاق ہے کہ جامعات میں اِس صنف پر زیادہ کام صنفِ نازک نے کیا ہے۔ جامعہ پنجاب میں ممتاز مفتی کی خاکہ نگاری پر اور علامہ اقبالؒ اوپن یونی ورسٹی میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ہی مقالے لکھے ہیں۔ "صوبہ سرحد میں خاکہ نگاری" کے عنوان سے گل ناز بانو جامعہ پشاور سے ایم فل کر چکی ہیں۔ڈاکٹر سائرہ ارشاد کا مقالہ "بہاول پور میں اُردو خاکہ نگاری۔ تفہیم کے چند زاویے" سے خطۂ بہاول پور کے اہم خاکہ نگاروں کے کام سے آگاہی ملتی ہے۔ شاہدہ بخاری نے بلوچستان میں اُردو خاکہ نگاری" کے موضوع پر تحقیقی کام کیا ہے۔اُن کا مقالہ چھپ بھی چکا ہے۔ جامعہ سندھ سے فہمیدہ شیخ بھی خاکہ نگاری کے حوالے سے کام کر رہی ہیں۔ فوزیہ ارشد کا پرچہ برائے ایم اے "محو قلم کا بیاں" (محمد طفیل) اضافے کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ صنم نسیم کا مقالہ "اُردو خاکہ۔ فن اور روایت" بھی کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک کے مقالے "اُردو نثر میں طنز و مزاح" میں صنف خاکہ نگاری کے حوالے سے اہم باب شامل ہے۔ڈاکٹر سیّد محمد عارف کا مقالہ برائے ڈاکٹریٹ "شاہد احمد دہلوی۔ حالات و آثار" انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام چھپ چکا ہے اور ڈاکٹر محمد عباس نے اپنا مقالہ برائے ڈاکٹریٹ "پاکستان میں خاکہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ۱۹۹۱ تا ۲۰۰۵ئ" کے عنوان سے تکمیل کیا تھا۔ محمد شعیب نے علامہ اقبالؒ اوپن یونی ورسٹی سے "اُردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت کا فکری اور تجزیاتی مطالعہ" کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کیا۔ اعجاز بابو نے "سندھ میں اُردو خاکہ نگاری" کے عنوان سے ایم فل کے لیے مقالہ لکھا تھا۔ اب وہ اِس عنوان کو وسعت دے کر یعنی "اکیسویں صدی میں اُردو خاکے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کر رہے ہیں۔ محمد سلیم نے جی سی فیصل آباد سے "اُردو خاکہ نگاری۔ اکیسویں صدی میں" کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ تحریر کیا ہے۔ایاز علی نائب (شاید) شاہ عبداللطیف یونی ورسٹی سکھر سے "خواتین کی اُردو خاکہ نگاری) کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے زیرِ اہتمام متعدد اہم خاکہ نگاروں کے فن و شخصیت پر کُتب شائع ہو چکی ہیں۔

بے شک مختلف جامعات میں خاکہ نگاری/ خاکہ نگاروں کے حوالے سے کافی کام ہو چکا ہوگا اور اب بھی ہو رہا ہوگا۔ لیکن اشاعتی مراحل طے نہ کر پانے کی وجہ سے سامنے نہیں آ رہا۔ اب تک مطبوعہ و غیر مطبوعہ مقالات دیکھنے کے بعد خوشی نہیں ہوتی۔ بیش تر مقالات کا بڑا حصہ صرف مواد کی مقدار کی شرط پورا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ پہلے کی کہی گئی باتوں کو بار بار دُہرا دیا جاتا ہے۔ بار بار سامنے کی بیس تیس اہم کُتب پر بات کی جاتی ہے۔اِس سلسلے میں مقالہ نگار سے زیادہ نگران پر ذِمہ داری عائد ہوتی ہے۔

خاکہ نگاری کے حوالے سے نجمہ سہیل، ڈاکٹر مرحب قاسمی، اختر جمال، سیّدہ انیس فاطمہ، حجاب امتیاز علی۔ حمیدہ اختر پوری، سحاب قزلباش، صفورہ خیری، ڈاکٹر عالیہ امام، ڈاکٹر نجیبہ عارف، منزہ یاسمین، تاج بیگم فرخی، مہناز ضمیر، فوزیہ ارشد، نیلم احمد بشیر نے مقدار و معیار کے لحاظ سے معقول کام کیا ہے اور بیش تر کام کتابی صورت میں چھپ بھی چکا ہے۔

موجودہ دور تعلقات، بھاگ دوڑ اور خوشامد کا دور ہے۔اِس مثلث سے ہٹ کر کام کرنا ایک جہاد ہے۔ جن خاکہ نگاروں نے اِس جہاد کا قصد کیا اُن کی کتابوں کا بھی وہی حشر ہوا جو ایسی شخصیات کا ہوا کرتا ہے۔

اختر حامد خان، قمر یورش کے نام اِس سلسلے کی مثال ہیں۔ دونوں صاحبان نے بساط بھر اچھے خاکے لکھے اور یہ خاکے کتابی صورت میں چھپے بھی مگر میں نے کسی محقق، نقاد، مبصر سے ان کا ذِکرِ خیر پڑھا نہ سنا۔

نقوش لاہور کے ضخیم انتخاب "شخصیات نمبر" کے بعد کسی رسالے نے خاکہ نگاری کا جامع نمبر ترتیب نہیں دیا۔ کتابی صورت میں ضرور چند انتخاب شائع ہوئے ہیں۔ ضیا ساجد نے دو کتابوں "منتخب شاہکار خاکے" اور "ممتاز ادیبوں کے منتخب خاکے" میں خاکوں کا انتخاب پیش کیا تھا۔ "اُردو کے بہترین شخصی خاکے" مرتبہ: مبین مرزا تین جلدوں پر مشتمل انتخاب ہے۔ "اُردو کے نادر و کمیاب خاکے" مرتبہ: راشد اشرف کی اب تک پانچ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ خاکوں کے انتخاب پر مبنی کتابیں "اُردو کے شاہکار خاکے" مرتبہ: خلیل احمد دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ "دس یادگار خاکے" مرتبہ: ڈاکٹر انوار احمد، "بیس یادگار خاکے" مرتبہ: شازیہ یاسمین، "آفتاب و ماہتاب" مرتبہ: شاعر علی شاعر چھپ چکی ہیں۔ راقم (شاہد حنائی) نے بھی خاکوں کے انتخاب ترتیب دیے ہیں: "ماں"، "الاؤ"، "خاکے"، "فیض احمد فیض شخص و عکس"، "احمد ندیم قاسمی"۔ خود نوشت خاکوں کے بھی متعدد انتخاب چھپ چکے ہیں۔

میں خاکہ نگاری کی صورتِ حال سے نامطمئن ہونے کے باوجود مایوس ہرگز نہیں۔ یہ انسان کا انسان کو سمجھنے اور سمجھانے کا علم ہے۔ سو جب تک انسان وجود رکھتا ہے اور اُردو زبان سلامت ہے تو خاکہ لکھا اور پڑھا جاتا رہے گا۔

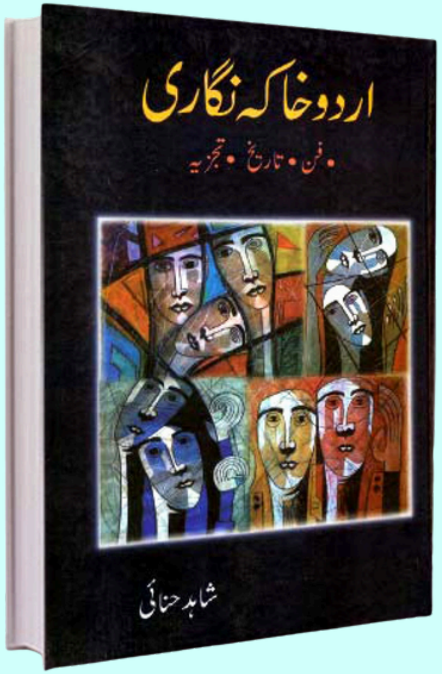

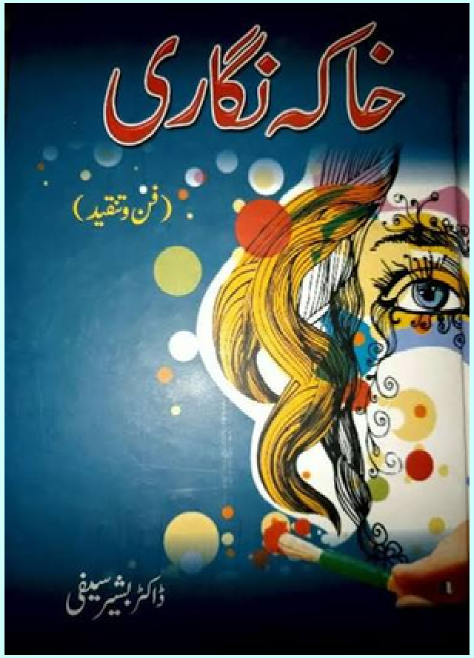

پی بی سی کراچی کے پروگرام "تخلیق" میں نشر کیا گیا
پروڈیوسر: میمونہ شمیل

بشکریہ پی بی سی کراچی

فیچر

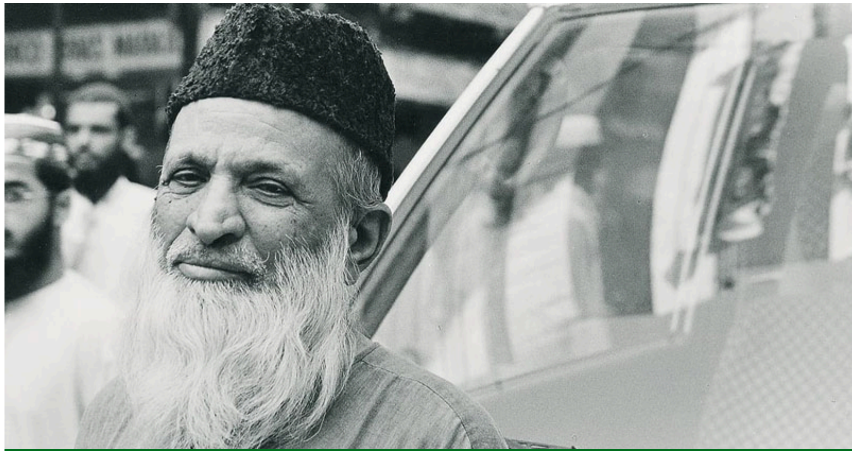

عبدالستار ایدھی ؛ مجسم انسانیت

تحریر: پرویز اختر
پروڈیوسر: آمنہ شیخ

راوی۔۱: انسانیت کیا ہے؟ایک انسان کا دوسروں کے کام آنا، مشکل وقت میں ساتھ دینا، گرتے ہوئوں کا ہاتھ تھام لینا، بے کس و نادار کی مدد کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ضرورت مندوں کو کپڑے اور دیگر ضرورت کی چیزیں فراہم کرنا اور مالی مدد ہی نہیں، کسی کے دکھ درد میں ہمدردی کرنا اور اس کی دلجوئی کرنا وغیرہ۔ یہ خصوصیت اللہ نے ہر انسان کو ودیعت کی ہے۔ ویسے تو دنیا کا ہر مذہب یا کوئی بھی معاشرہ انسانیت کی تلقین اور پرچار کرتا ہے لیکن دینِ اسلام نے اِس پر خاص زور دیا ہے اور اس کو عبادت کا درجہ دیا ہے

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اوریوں بھی کہا گیا

یہی ہے عبادت یہی دین وایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

راوی۔۲: یہ بھی حقیقت ہے کہ یوں تو دنیا کا ہر انسان کسی نہ کسی صورت اور اپنی بساط کے مطابق دوسروں کی مدد کرتا رہتا ہے لیکن کچھ لوگ اِس خدمت کی انجام دہی کیلئے خود کو وقف کر دیتے ہیں۔ وہ ایک ٹیم، ایک گروپ یا ایک ادارے کی صورت میں انسانیت کی خدمت کے کاموں کا بیڑا اُٹھاتے ہیں۔ کہیں بے سہارا یتیم بچوں کی پرورش، کہیں تعلیم و تربیت اور کہیں بے سہارا بوڑھے اور کمزور خواتین اور مردوں کے لئے اولڈ ہوم کی شکل میں اجتماعی طور پر خدمات انجام دی جاتی ہیں کہ ویسے بھی یہ کام کسی ایک شخص کے بس کا نہیں۔ لیکن پاکستان میں ایک شخصیت ایسی بھی گزری ہے جس نے فلاحی خدمات کی انجام دہی کو ایک مشن کی طرح اپنایا اور تن تنہا پاکستان کے سب سے بڑے فلاحی ادارے میں ڈھال دیا جس کی ایمبولینسز کی تعداد دنیا کے کسی بھی فلاحی یا امدادی ادارے کی ایمبولنس سروس میں سب سے زیادہ ہے اور اِس کا اعتراف مشہور کتاب بک آف ورلڈ میں موجود ہے۔ اور وہ شخصیت نہ صرف ہم سب کے دلوں میں بسی ہے بلکہ پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں اِس کی شخصیت معروف و مقبول ہے۔ اِس شخصیت کا نام ہے عبدالستار ایدھی۔

(ایدھی صاحب کی آواز میں چند جملے)

"میں تو فقیر ہوں بعض لوگ مجھے ملنگ کہتے ہیں۔ سیاچن سے لے کر ننگر پارکر تک پورے پاکستان کو سمیٹا، آل فور ہوم لیس کوئی بھی لاوارث ملا کار میں اُٹھا کر اُس کو داخل کروایا نہ ذات پات نہ مذہب صرف انسانیت"۔

راوی۔۱: عبدالستار ایدھی نے 28فروری1928ء کو اِس دنیا میں آنکھ کھولی۔ اُن کے ماں باپ جونا گڑھ کے ایک علاقے بانٹوا میں رہتے تھے۔ اُن کے والد عبدالشکور ایدھی دوسرے شہر میں کام کرتے تھے جہاں سے ہر ماہ گھر کیلئے ضرورت کا تمام سامان بھیج دیتے۔ ننھے عبدالستار ایدھی نے دیکھا کہ اُن کی والدہ گھر کے اِس سامان میں سے ایک حصہ نکال کر دوسروں کی مدد کیلئے بھیج دیتی تھیں۔ اسی طرح جب عبدالستار ایدھی نے اسکول جانا شروع کیا تو اُن کی ماں نے بھی اُن کو روزانہ دو سکے اِس ہدایت کے ساتھ دینا شروع کئے کہ ایک تمہارے خرچ کیلئے ہے اور دوسرا کسی ضرورت مند کو دینے کے لیئے۔ دوسروں کی مدد کے لیئے ماں کی یہ عملی تعلیم اُن کی آئندہ کی زندگی کی ایک مضبوط بنیاد بن گئی اور یہ جذبہ اُن کی رگ رگ میں بس گیا۔ ابھی اُن کی عمر گیارہ سال ہی کی تھی کہ اُن کی والدہ بیمار پڑ گئیں اور اُن کو والدہ کی خدمت کی خاطر اسکول چھوڑنا پڑا۔ بیماری کی وجہ سے والدہ ذہنی مریضہ بھی بن گئیں جس کا ایدھی صاحب پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اسی دوران میں قیامِ پاکستان عمل میں آیا اور کچھ دن بعد ہی اُن کا خاندان بھی کراچی آ گیا اور کھارادر کے علاقے میں مقیم ہو گیا۔

راوی۔۲: کچھ عرصے بعد اُن کی والدہ کی وفات ہو گئی۔ اُس وقت اُن کی عمر تقریباً19 سال تھی۔ ایدھی صاحب نے کچھ عرصہ ایک کپڑے کی دکان پر کام کیا لیکن اُن کے اندر والدہ کا دیا ہوا دوسروں کی خدمت کا جذبہ بے چین رکھتا تھا۔ چنانچہ دکان پر جی نہ لگا اور اُنہوں نے اپنے مکان کے ایک کمرے میں ہی چھوٹی سی ڈسپنسری کھول لی جہاں سے مریضوں کو مفت دوائیں دی جاتیں۔ یہ دوائیں صرف اُن کے علاقے میں رہنے والے اُن کی کمیونٹی کے لئے ہی نہیں تھیں، بلکہ بلا لحاظ مذہب، رنگ، نسل تمام ضرورتمند افراد کو دی جاتی تھیں۔ اِس سے پہلے جب کراچی میں اُن کی والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور اُن کو ہسپتال لے جانا پڑا تو اُس وقت کوئی ایمبولنس دستیاب نہ تھی۔

چنانچہ اُن کو رکشہ میں لے گئے۔ ایدھی کے ذہن میں بھی یہ صورتحال بار بار اُبھر رہی تھی کہ مریضوں کو ہسپتال پہنچانے کا معقول بندوبست نہیں ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے کام کو توسیع دینے کی غرض سے ایدھی ٹرسٹ قائم کیا جس کیلئے اُن کے دوست حاجی غنی عثمان نے مدد کی۔ یوں اُنہوں نے رقم جمع کر کے ایک کار خریدی اور ڈرائیونگ سیکھی اور اِس کار سے وہ ایمبولنس کا کام لینے لگے۔ اُنہوں نے 40 سال سے زیادہ عرصے تک خود بھی ایمبولنس چلائی۔ آج پاکستان بھر میں اُن کی ایمبولنس سروس جاری ہے جن کی تعداد 1800 سے زیادہ ہو چکی ہے اور یہ دنیا میں ایمبولنس رکھنے والے کسی بھی ادارے کے مقابلے میں سب سے بڑی ہے۔ زمینی راستوں پر تو گاڑیاں ہی ایمبولنس کا کام دیتی ہیں لیکن ایدھی ٹرسٹ میں اب کشتیوں اور ہیلی کاپٹر کی ایمبولنس بھی دستیاب ہے جو سمندروں اور دریائوں وغیرہ میں اور ایسی جگہ جہاں زمینی ایمبولنس نہ جا سکے، حادثات میں لوگوں کی جانیں بچانے اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچانے کے کام آتی ہیں۔

(ایدھی صاحب کے انٹرویو کا حصہ)

"مجھے مریضوں سے بہت ہمدردی تھی اور ایمبولینس چلانے کا شوق تھا۔ میں نے ایمبولینس سروس شروع کی ایک گاڑی بھی لی میں نے زندگی میں ایمبولینس کے سوا کوئی گاڑی نہیں چلائی۔ 48 سال میں نے ایمبولینس چلائی لاوارثوں کو اُٹھانا، ہسپتال میں چھوڑنا اور ہسپتال سے گھر چھوڑنا"۔

راوی۔۱: ایدھی صاحب کے سچے جذبے اور بڑھتے ہوئے کام کے پیشِ نظر اُن کو ایک ایسی مددگار ہستی کی ضرورت تھی، جو دن رات اُن کے ہمراہ مصروفِ عمل رہے۔ ایسی شخصیت اُن کی زندگی کی ساتھی کے علاوہ اور کون ہو سکتی تھی۔ ایدھی صاحب کے نرسنگ کے ادارے میں کئی لڑکیاں کام کرتی تھیں جو ضرورت مند بھی تھیں لیکن ایدھی صاحب کسی ایسی ہستی کی تلاش میں تھے جو اُن کا ساتھ نبھا سکیں۔ آخر اُن کی نظر بلقیس بانو پر پڑی جو خدمتِ خلق کے جذبے کے ساتھ اُن کے نرسنگ ٹریننگ کورس میں شامل ہوئی تھی اور بڑی تندہی سے کام کر رہی تھی۔ اُنہوں نے بلقیس بانو سے اپنے خیال کا اظہار کیا تو وہ انکار نہ کر سکی اور اِس طرح بلقیس بانو سے بلقیس ایدھی بن گئی۔ پھر اُس دن سے ایدھی صاحب کے انتقال کے وقت تک اُنہوں نے ایسا ساتھ نبھایا جو بے مثال ہے اور یہی نہیں اُن کے بعد بھی جس طرح اُنہوں نے ادارے کے امور کو سنبھالا اور ایدھی صاحب کے بیٹے فیصل کی معاونت کرتے ہوئے اپنی آخری سانس تک خدمات انجام دیں۔ اُنہوں نے ایک انٹرویو میں ایدھی صاحب کے بارے میں بتایا۔

(بلقیس ایدھی کے انٹرویو کا حصہ)

"میں نے اُن کی ہر طرح سے مدد کی۔ بہت پیار سے اُن کا ساتھ دیا اُن کو دنیاداری سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اللہ کا حکم تھا تو میری شادی ہوئی۔ بس کام میں مگن رہتے تھے۔ میرا گھر سامنے ہی تھا۔ میرا ایک پائوں گھر میں ہوتا تھا اور ایک ایدھی ہوم میں ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی ایمرجنسی ہوتی تھی تو ہماری ٹیم، ڈاکٹرز، ساتھ جاتے تھے۔ باہر کے ملکوں میں بھی جا کر قدرتی آفات میں ہم نے کام کیا ہے۔"

راوی۔۲: ایدھی ٹرسٹ کے قیام سے پہلے ایدھی صاحب کی خدمات صرف مریضوں اور اُن کے علاج اور ادویات کی مفت فراہمی تک تھیں۔ پھر اُنہوں نے اپنے کام کو مزید توسیع دیتے ہوئے یتیم بچوں کی سرپرستی کیلئے سنٹر قائم کیا۔ بے سہارا اور نادار خواتین کو پناہ دینے کیلئے خواتین سنٹر قائم کئے جہاں اُن کو کھانے پینے اور خوراک کی فراہمی کے علاوہ مختلف کام بھی سکھائے جاتے ہیں۔ اِن اداروں میں آنے والی بے سہارا لڑکیوں کے لئے رشتوں کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔ اب تک ہزاروں لڑکیاں اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں۔ اِس دوران میں ایدھی صاحب کو بعض جگہوں سے نوزائیدہ بچوں کی لاشیں ملیں۔ یہ دیکھ کر اُن کو بہت صدمہ ہوا اور اُنہوں نے جھولا اسکیم کا آغاز کیا جس کے تحت ملک بھر میں قائم تمام ایدھی سنٹرز کے باہر جھولے رکھوا دیئے کہ لوگ لاوارث بچوں کو کوڑے میں پھینکنے کی بجائے اُن جھولوں میں ڈال دیں۔ پھر ایدھی فائونڈیشن اُن کو لے کر اُن کی مکمل دیکھ بھال اور پرورش کرنے لگی۔

اگرچہ اِس پر کئی اعتراضات بھی ہوئے لیکن ایدھی صاحب نے کسی کی پرواہ نہیں کی اور تن من دھن سے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ اُنہوں نے سینٹر میں موجود بچوں کیلئے اسکول بھی قائم کیا جہاں میٹرک تک تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ اِس کے علاوہ ذہنی مریضوں کیلئے ہسپتال قائم کیا۔
یہ سب کام اُنہوں نے بغیر کسی لالچ کے کئے اور اُن سے چھوٹا سا فائدہ بھی نہیں اُٹھایا۔ اُن کی زندگی علامہ اقبالؒ کے اِس شعر کی تفسیر تھی کہ:

نہ مال و دولتِ دنیا، نہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لاالہ الااللہ

اُنہوں نے صرف دو جوڑے کپڑوں میں پوری زندگی گزاری اور کہا کہ مجھے کفن کی بجائے اسی جوڑے میں دفن کیا جائے۔

راویؑ۱: ویسے تو لوگ بھی ایدھی صاحب کو بڑی سے بڑی رقم اِس یقین کے ساتھ عطیہ کر دیتے کہ یہ فلاحی کاموں میں ہی صرف ہو گی اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ اُنہوں نے بلقیس ایدھی فائونڈیشن بھی قائم کی۔ ایک مرتبہ اُن کو بہت زیادہ پیسوں کی ضرورت پڑی تو اُنہوں نے خود شہر میں مختلف جگہ پر جھولی پھیلا کر لوگوں سے پیسے وصول کئے۔ اُن کا اصول تھا کہ کسی سیٹھ یا بڑے آدمی سے پیسہ نہیں مانگنا۔ اِسی طرح جب اُن کو کہا گیا کہ ایسے فلاحی اداروں کیلئے تو کئی ممالک کے لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، لیکن اُنہوں نے پاکستان کے علاوہ کبھی کسی دوسرے ملک سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا، جب کہ اُنہوں نے پچاس سے زیادہ ممالک کے دورے بھی کئے لیکن کہیں سے بھی چندہ وغیرہ نہیں لیا۔ یہاں تک کہ اُن کے گھر کا خرچ بھی اِن دو دکانوں کے کرایوں سے چلتا جو اُنہوں نے ابتداء میں خریدی تھیں۔ مشہور ہے کہ اُن کے بچے نے جب سائیکل لینے کی فرمائش کی تو صاف انکار کر دیا کہ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ اُن کی عزت، خلوص اور دیانتداری کے پیشِ نظر اُن کو سیاست میں آنے کی بھی دعوت دی گئی، مگر اُنہوں نے قبول نہ کی۔ ایک مرتبہ ایک مذہبی حکومتی کمیٹی میں شامل ہوئے مگر بہت جلد اُس سے علیحدہ ہو گئے اور پوری تندہی کے ساتھ اپنے مشن میں مشغول ہو گئے۔

آج ایدھی فائونڈیشن کے تحت کراچی میں 8 بڑے ہسپتال کام کر رہے ہیں، اِن کے علاوہ آنکھوں کے علاج کے کلینک، ذیابیطس سینٹر، سرجیکل یونٹس، ایک چھوٹا کینسر ہسپتال بھی جبکہ موبائل اور ریلیف ڈسپنسریز اور دو بلڈ بینک بھی قائم کئے۔ ایدھی صاحب کا کہنا تھا کہ میں کار میں نہیں ایمبولنس میں جاتا ہوں تاکہ راستے میں اگر کوئی حادثہ یا ایسا واقعہ نظر آئے تو میں لوگوں کی مدد کر سکوں۔

راوی۔۲: ایدھی فائونڈیشن کی خدمات کا دائرہ مزید وسیع کرتے ہوئے ایک لیگل ڈپارٹمنٹ بھی قائم کیا گیا جو نہ صرف اپنے ادارے کے قانونی مسائل کی دیکھ بھال کرتا ہے بلکہ ضرورت مند اور اہل قیدیوں کو مفت قانونی مدد بھی فراہم کرتا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ قیدیوں کی دیکھ بھال کے لئے فائونڈیشن کی طرف سے ڈاکٹروں کی ٹیم جیلوں کا دورہ کرتی ہے اور قیدیوں کو مفت طبّی سہولتیں اور دوائیں فراہم کی جاتی ہیں۔ اسی طرح گم شُدہ بچوں کی بازیابی کے سلسلے میں بھی فائونڈیشن کی ٹیم مسلسل کام کر رہی ہے اور اب تک کئی بچے بازیاب کئے جا چکے ہیں۔ اِسی طرح قدرتی آفات، جیسے شدید بارشیں، سیلاب اور زلزلے وغیرہ جیسے قومی مسائل میں بھی ایدھی فائونڈیشن کی ٹیمیں پیش پیش نظر آتی ہیں اور متعلقہ علاقوں میں پہنچ کر نہ صرف متاثرہ افراد اور مال مویشی کو بچانے میں مدد دیتی ہیں بلکہ اِن آفات کے بعد متاثرہ لوگوں کی بحالی اور خوراک وغیرہ کا بھی باقاعدگی کے ساتھ بندوبست کیا جاتا ہے۔ اِس طرح کی خدمات کیلئے کئی بیرونی ممالک میں بھی امدادی کام انجام دیئے گئے ہیں، جن میں سری لنکا، بنگلہ دیش، مصر، نیپال، یمن امریکہ، برطانیہ اور فلسطین شامل ہیں جن کو نہ صرف ضروریات کی اشیاء، دوائیں، کپڑے، روزمرہ کی ضروریات کی اشیاء فراہم کی گئی ہیں بلکہ چندہ جمع کر کے مالی امداد بھی کی گئی اور یہ سلسلہ بھی پابندی سے جاری ہے۔

راوی۔۱: عبدالستار ایدھی نے تمام خدمات کسی ستائش کی تمنا یا صلے کی پروا کے بغیر انجام دیں لیکن ملکی اور غیر ملکی سطح پر اُن کی بے مثال خدمات کو سراہا گیا اور اُن کی شخصیت کیلئے اعزازات پیش کئے گئے۔ اِن میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز دیا گیا جبکہ پاکستان سول سوسائٹی کی جانب سے پاکستان آرمی کی طرف سے شیلڈ آف آنر، پاکستان سول سوسائٹی کی جانب سے پاکستان سوک ایوارڈ، جناح سوسائٹی کی جانب سے جناح ایوار، باچا خان امن ایوارڈ اور ہیومن رائٹس ایوارڈ شامل ہیں۔ عالمی سطح پر ایدھی صاحب کی خدمات کے اعتراف میں لینن پیس پرائز، روٹری انٹرنیشنل کی جانب سے Paul Harris Fellow، اٹلی کی جانب سے انٹرنیشن بالزن پرائز، متحدہ عرب امارات کی ہیومن میڈیکل سروسز کی جانب سے ہمدان ایوارڈ، سیول کی جانب سے سیول امن ایوارڈ، انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری، یونیورسٹی آف بریڈفورڈ کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری، یونیسکو مدن جیت سنگھ انعام اور لندن پیس ایوارڈ شامل ہیں۔ اِس کے علاوہ بھی کئی ملکی اور غیر ملکی تنظیموں کی جانب سے بھی متعدد ایوارڈز اور اعزازات سے نوازا گیا۔

راوی۔۲: ہر ذی روح کی طرح ایدھی صاحب کا بھی آخری وقت آ پہنچا، یہ تھا 8 جولائی 2016ء اور اُس وقت ایدھی صاحب کی عمر 88 برس تھی۔ اُنہوں نے وصیت کی تھی کہ میرے جسم کا جو بھی حصہ کسی کے کام آئے وہ عطیہ کر دیا جائے لیکن اُن کی بیماری کی نوعیت ایسی نہ تھی اور صرف آنکھوں کا کورنیا حاصل کیا گیا جو دو انسانوں کی زندگی میں آنکھوں کا نور واپس لے آیا۔ عبدالستار ایدھی پاکستان کے واحد سویلین تھے جن کی تدفین سرکاری سطح پر کی گئی اور 19 توپوں کی سلامی دی گئی۔ اُن کے جنازے میں صدرِ پاکستان، چیئرمین سینیٹ، سندھ اور پنجاب کے وزرائے اعلیٰ، چیف آف آرمی اسٹاف اور متعدد مقتدر شخصیات نے شرکت کی۔ گوگل نے 2017ء میں کئی ممالک میں اپنے لوگو کی جگہ ڈوڈل استعمال کر کے ایدھی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ڈیفنس ہائوسنگ سوسائٹی کراچی نے کلفٹن کے علاقے میں 5 کلو میٹر طویل ایک سڑک اُن کے نام سے منسوب کر دی جبکہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے 50 روپے کا یادگاری سکہ جاری کیا اور محکمۂ ڈاک نے یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ عبدالستار ایدھی کو مختلف القابات بھی دیئے گئے جن میں این جل آف مرسی یا رحمت کا فرشتہ، مدر ٹریسا جیسی شخصیت اور Richest poor man کا لقب دیا گیا۔ ایدھی صاحب کے بعد اُن کی بیگم بلقیس ایدھی اور بیٹے فیصل ایدھی نے اُن کا کام سنبھالا اور بلقیس ایدھی کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری فیصل ایدھی نے سنبھالی۔

"میری اُن سے زیادہ وابستگی والد کی حیثیت سے کام تھی اور ایک رہنماء اور دوست کی حیثیت سے زیادہ تھی۔ میں نے ہمیشہ اُن کے مشن کو ہی اپنا مشن سمجھا تھا اور اِسی مشن کی وجہ سے میری اُن وابستگی تھی۔"

بشکریہ پی بی سی کراچی

وزیر اعلی پنجاب کے مشیر برائے مصنوعی ذہانت جناب علی مصطفی ڈار سے خصوصی گفتگو پر مبنی رپورٹ

رپورٹ: صدف رانی (پروگرام مینیجر)

FM101 نے ایک خصوصی پوڈ کاسٹ میں وزیر اعلیٰ پنجاب کے مشیر برائے مصنوعی ذہانت جناب علی مصطفی ڈار سے بات چیت کی۔ جناب علی مصطفی ڈار نے پنجاب میں جاری مصنوعی ذہانت کی تاریخی منصوبوں نوجوانوں کے لیے روزگار کے نئے مواقع، اپنے بیٹے ابراہیم کے آٹزم کے سفر اور اپنے خاندان کی قومی خدمات پر کھل کر بات کی۔ ایک ایسی گفتگو جس نے قیادت، ٹیکنالوجی اور محبت کو ایک ہی دھاگے میں پرو دیا۔

پوڈ کاسٹ کی میزبان سعدیہ ستار نے وزیر اعلیٰ پنجاب کے مشیر برائے مصنوعی ذہانت جناب علی مصطفی ڈار سے بات چیت کی۔ جناب علی مصطفی ڈار سے ایک سوال کہ " حکومتِ پاکستان جدید ٹیکنالوجی اور خصوصاً مصنوعی ذہانت سے متعلق کیا اقدامات اُٹھا رہی ہے" کے جواب میں اُنہوں نے کہا کہ وزیر اعلیٰ پنجاب محترمہ مریم نواز شریف کی زیرِ صدارت ایک باقاعدہ AI آفس قائم کیا گیا ہے جس کی روزمرہ کارکردگی کی نگرانی وہ بطور مشیر خود کر رہے ہیں۔ اُن کے مطابق اِس آفس کو ایک نجی ادارے کی سی مستعدی اور کارکردگی کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے وضاحت کی کہ پنجاب میں وزیر اعظم جناب محمد شہباز شریف کے دورِ وزارتِ اعلیٰ میں قائم کیے گئے اسپیشل مانیٹرنگ یونٹس (SMUs) کے تصور کو جدید خطوط پر آگے بڑھاتے ہوئے اب دنیا کا پہلا AI ڈلیوری یونٹ تشکیل دیا جا رہا ہے جو حکومتی اہداف کو کہیں زیادہ مؤثر اور تیز رفتار انداز میں حاصل کرنے میں مدد دے گا۔ اُن کے کہنے کے مطابق منصوبہ بندی مکمل ہو چکی ہے اور زمینی سطح پر عملی کام بھی شروع ہو چکا ہے۔

مصنوعی ذہانت کے حوالے سے ایک سوال کہ "جدید ٹیکنالوجی خصوصاً مصنوعی ذہانت (AI) کے لیے ڈیٹا کس حد تک ضروری ہے" کے جواب میں اُنہوں نے کہا کہ مصنوع ذہانت کی بنیاد ڈیٹا پر ہوتی ہے اور اِس لحاظ سے پنجاب ایک منفرد پوزیشن میں ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب محترمہ مریم نواز نے حال ہی میں "پنجاب سوشیو اکنامک رجسٹری" کی تکمیل کروائی ہے جسے وہ عملاً پنجاب کی جدید ترین مردم شماری قرار دیتے ہیں۔ ایسا جامع ڈیٹا جو ملک کے کسی اور صوبے کے پاس دستیاب نہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اِس ڈیٹا کی بدولت پنجاب اگلے چند برسوں میں دنیا کے ٹاپ 10 سے 15 ممالک کی صف میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے تاکہ پنجاب نہ صرف پاکستان بلکہ پورے حصے کے لیے ایک بینچ مارک بن سکے۔ اُنہوں نے پاکستان کی نوجوان نسل جن زی اور جن الفا کی طرف خاص توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ اُن کے مطابق مصنوعی ذہانت (AI) آفس کی جانب سے تعلیم کے شعبے میں اہم اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ وزیر اعلیٰ کی خصوصی دلچسپی سے سرکاری اسکولوں میں گریڈ ون سے ہی نصاب میں مصنوعی ذہانت کو باقاعدہ شامل کیا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے نشاندہی کی کہ پاکستان دنیا کی سب سے بڑی فری لانسنگ مارکیٹ میں سے ایک ہے مگر ابھی تک زیادہ تر فری لانسرز چھوٹے درجے کے کام کر رہے ہیں۔

حکومتِ پنجاب کا منصوبہ ہے کہ اِن نوجوانوں کو مصنوعی ذہانت اور دیگر جدید ٹیکنالوجیز میں مہارت دلوا کر اُن کی آمدنی میں نمایاں اضافہ کیا جائے۔ اُنہوں نے کہا کہ جو نوجوان فری لانسر پہلے 500 روپے کما رہا تھا وہ مناسب مہارت کے ساتھ 10 سے 20 گنا زیادہ کما سکتا ہے کیونکہ اُبھرتی ہوئی ٹیکنالوجیز میں اوسطاً عالمی معاوضے تقریباً 10 ہزار ڈالر تک جا پہنچتے ہیں۔ اُن کا پیغام یہ تھا کہ نوجوان اپنے آپ کو اِس ٹیکنالوجی کے لیے تیار رکھیں کیونکہ حکومتِ پنجاب کی جانب سے آنے والے دنوں میں اُن کے لیے بہت سے مواقع پیدا ہوں گے۔

گفتگو کا ایک نہایت جذباتی اور اہم پہلو جناب علی مصطفی ڈار کے بیٹے ابراہیم سے متعلق تھا جو آٹزم اسپیکٹرم پر ہیں۔ اِس حوالے سے ایک سوال کہ "بحیثیت ایک باپ کے جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کا بیٹا آٹزم کا شکار ہے تو آپ نے کیا تدابیر ختیار کیں" اِس کے جواب میں اُنہوں نے بتایا کہ ابراہیم محض دو برس کی عمر میں تھے جب پہلی بار کچھ علامات محسوس ہوئیں اور مرحلے میں ڈاکٹروں کے متضاد آراء اور تفصیلی جانچ کے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ اُنہوں نے والدین کو یہ اہم پیغام دیا کہ تین سے سات، آٹھ برس کی عمر کا عرصہ بچے کی نشوونما کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے اور اِس دوران اسپیچ تھیراپی اور ABA پر جتنی زیادہ توجہ دی جائے بچے کے معیارِ زندگی میں ایک نمایاں فرق پڑتا ہے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُن کے خاندان نے ابتدائی پانچ برس نہایت جانفشانی سے ابراہیم کی تھیراپی پر توجہ مرکوز رکھی جس کے نتیجے میں انہیں ایک 24 گھنٹے تھیراپسٹ ملیں جو آج بھی خاندان کا حصہ ہیں۔ والدین کی توجہ اِس جانب دلاتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ جو اپنے آٹس ٹک بچوں کو معاشرتی بدنامی کے خوف سے چھپاتے ہیں اور انہیں سماجی حلقوں سے دُور رکھتے ہیں اُن کے نزدیک ایسا کرنا ہرگز درست نہیں کیونکہ اُن بچوں سے زیادہ معصوم اور پیارے بچے کوئی اور نہیں ہوتے۔ اُن کا کہنا تھا کہ خاص بچے والدین کے لیے جنت کی مانند ہیں اور اُنہیں پھولوں کی طرح سنبھالنا اور اللہ تعالی کا اِس نعمت پر شکر ادا کرنا چاہیے نہ کہ شکایت یا ناشکری کی جائے۔ اُنہوں نے والدین کی توجہ اِس بات کی طرف دلوائی کہ آپ کا بچہ آپ کا مستقبل ہے۔ اِس میں کبھی کوئی بدنامی نہیں صرف محبت اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔

میزبان کے اِس سوال پر کہ "اپنے والد کو دن رات قومی خدمت میں مصروف دیکھ کر بطور بیٹا کیسا محسوس ہوتا ہے" علی مصطفی ڈار نے کہا کہ وہ حیران ہیں کہ یہ لوگ آرام کب کرتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ جناب فیلڈ مارشل، جناب وزیر اعظم اور اُن کے اپنے والد مشیرِ خزانہ جناب اسحاق ڈار سمیت تمام قومی رہنما نہایت محنت سے کام کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے پاکستان کے مستقبل پر گہرا اعتماد ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ذاتی طور پر پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے بہت پُر اُمید ہیں اور موجودہ عالمی سطح کے تناؤ کے باوجود پاکستان نے علاقائی اور عالمی سطح پر اپنی اہمیت منوالی ہے اور اب دنیا اِسے ایک ایسی علاقائی طاقت کے طور پر تسلیم کرتی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُنہیں قوی یقین ہے کہ پاکستان اِس وقت ایک نہایت مضبوط پوزیشن پر کھڑا ہے اور آنے والے وقت میں مزید مستحکم ہو گا۔

گفتگو کے اختتام پر جناب علی مصطفی ڈار نے نوجوانوں کو اتحاد اور یکجہتی کا پیغام دیتے ہوئے کہا کہ ہر بچہ ہی غیر معمولی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے اور والدین معاشرے کو مختلف صلاحیتوں کے حامل بچوں کے لیے دوچند محبت اور توجہ دینی چاہیے۔ اُنہوں نے حالیہ قومی معرکے کی یاد میں منائی جانے والی مناسبت کا ذکر کرتے ہوئے قوم سے اپیل کی کہ سیاسی اور عسکری قیادت کے پیچھے متحد رہا جائے تاکہ دنیا کو پاکستان کی یکجہتی اور طاقت کا پیغام واضح طور پر پہنچے۔

کوٹ ڈیجی قلعہ ۔سندھ کی تاریخ، تہذیب اور دفاعی عظمت کا لازوال شاہکار

تحقیقی مضمون

تحریر: سلیم رضا شیخ

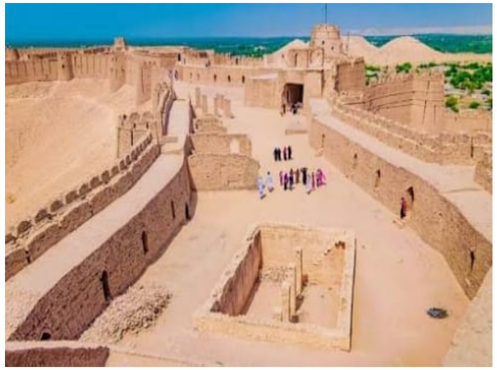

سندھ کی سرزمین اپنی ہزاروں سال پرانی تہذیب، تاریخی ورثے اور عظیم آثارِ قدیمہ کی بدولت دنیا بھر میں منفرد مقام رکھتی ہے۔اِنہی تاریخی یادگاروں میں ضلع خیر پور کی تحصیل کوٹ ڈیجی میں واقع کوٹ ڈیجی قلعہ اپنی مضبوط تعمیر، شاندار دفاعی منصوبہ بندی اور تاریخی اہمیت کے باعث نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ قلعہ نہ صرف سابق ریاست خیر پور کی عسکری طاقت کی علامت تھا بلکہ سندھ کی ثقافتی اور تاریخی شناخت کا بھی ایک اہم حصہ ہے۔ کوٹ ڈیجی قلعہ خیر پور شہر سے 25 کلو میٹر کے فاصلے پر قومی شاہراہ کے قریب ایک بلند چٹانی پہاڑی پر واقع ہے۔اِس کے اِرد گرد پھیلا ہوا پہاڑی سلسلہ اِس کی قدرتی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے جبکہ بلند مقام پر تعمیر ہونے کی وجہ سے یہ دفاعی اعتبار سے نہایت موزوں سمجھا جاتا تھا۔ قلعے سے اِرد گرد کے وسیع علاقے پر نظر رکھی جاسکتی تھی جس کی بدولت دشمن کی نقل و حرکت کا بروقت اندازہ لگایا جاتا تھا۔تاریخی روایات کے مطابق یہ قلعہ ریاست خیر پور کے پہلے حکمران میر سہراب خان تالپور نے انیسویں صدی کے آغاز، تقریباً 1812ء تا 1813ء کے دوران تعمیر کروایا۔ اِس کی تعمیر کا بنیادی مقصد ریاست خیر پور کی سرحدوں کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھنا اور ایک مضبوط دفاعی مرکز قائم کرنا تھا۔اُس دور میں یہ قلعہ ریاست کی عسکری اور انتظامی سرگرمیوں کا اہم مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ کوٹ ڈیجی قلعے کی تعمیر اُس زمانے کے اعلیٰ فنِ تعمیر کی بہترین مثال ہے۔اِس میں پتھر، اینٹ، چونا اور مٹی جیسے مضبوط تعمیراتی مواد استعمال کیے گئے جنھوں نے اسے دو صدیوں سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود مضبوطی سے قائم رکھا ہے۔ قلعے کی بلند و بالا فصیلیں، مضبوط برج اور وسیع احاطہ اِس کے دفاعی کردار کو نمایاں کرتے ہیں۔

قلعے کے تین بڑے داخلی دروازے خصوصی توجہ کے مرکز ہیں۔اِن دروازوں پر نصب لوہے کے نوکیلے کیل اُس دور کی دفاعی حکمتِ عملی کی بہترین مثال تھے۔ قدیم زمانے میں دشمن اکثر ہاتھیوں کے ذریعے قلعوں کے دروازے توڑنے کی کوشش کرتے تھے، مگر اِن نوکیلے کیلوں کی موجودگی ایسی کوششوں کو ناکام بنانے میں مؤثر کردار ادا کرتی تھی۔ قلعے کی فصیلوں پر متعدد برج تعمیر کیے گئے تھے جہاں سپاہی ہر وقت پہرہ دیتے تھے۔اِن برجوں پر توپیں اور دیگر اسلحہ نصب رہتا تھا تاکہ کسی بھی ممکنہ حملے کا فوری اور مؤثر جواب دیا جاسکے۔ قلعے کے اندر سپاہیوں کی رہائش، اسلحہ خانے، اناج کے گودام، پانی ذخیرہ کرنے کے انتظامات، اصطبل اور دیگر ضروری عمارتیں موجود تھیں جو اِس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ صرف ایک دفاعی قلعہ نہیں بلکہ ایک مکمل فوجی اور انتظامی مرکز تھا۔

کوٹ ڈیجی قلعے کی تاریخی اہمیت صرف اِس کی دفاعی حیثیت تک محدود نہیں۔اِس کے قریب واقع کوٹ ڈیجی تہذیب کے آثارِ قدیمہ جنوبی ایشیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں سے یہاں ہزاروں سال پرانے برتن، اوزار، زیورات، مٹی کے برتن اور دیگر نوادرات دریافت ہوئے جنھوں نے ثابت کیا کہ یہ علاقہ قدیم زمانے میں ایک ترقی یافتہ انسانی آبادی کا مرکز تھا۔ اسی بناء پر کوٹ ڈیجی کا نام عالمی آثارِ قدیمہ کی تحقیق میں بھی نمایاں مقام رکھتا ہے۔

قدرتی حُسن کے اعتبار سے بھی کوٹ ڈیجی قلعہ اپنی مثال آپ ہے۔ قلعے کی بلند فصیلوں سے دُور دُور تک پھیلے سرسبز کھیت، پہاڑ، قومی شاہراہ اور خیر پور کا خوبصورت منظر دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال پاکستان کے مختلف شہروں کے علاوہ بیرونِ ملک سے بھی سیاح، محققین، طلبہ اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے افراد یہاں کا رُخ کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تاریخی ورثہ موسمی اثرات اور قدرتی عوامل سے متاثر ضرور ہوا ہے، تاہم اس کی اصل شناخت اور مضبوطی آج بھی برقرار ہے۔ محکمہ ثقافت و آثارِ قدیمہ سندھ اِس تاریخی ورثے کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے اقدامات کر رہا ہے لیکن اِس مقام کو عالمی معیار کی سیاحتی سہولیات، بہتر رہنمائی، معلوماتی مراکز اور مؤثر تحفظ کی مزید ضرورت ہے تاکہ اِس کی تاریخی اہمیت کو آنے والی نسلوں تک محفوظ رکھا جاسکے۔

کوٹ ڈیجی قلعہ صرف اینٹوں اور پتھروں سے تعمیر ہونے والی ایک عمارت نہیں بلکہ یہ سندھ کی تاریخ، ریاستِ خیر پور کی شان، تالپور حکمرانوں کی بصیرت اور ہمارے قومی ورثے کی ایک روشن علامت ہے۔ اِس کی ہر دیوار، ہر برج اور ہر دروازہ ماضی کی عظمت، بہادری اور فنِ تعمیر کی لازوال داستان سناتا ہے۔ یہ ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے کہ ہم اِس تاریخی ورثے کی حفاظت کریں، اِس کی اہمیت کو نئی نسل تک پہنچائیں اور دنیا کو یہ بتائیں کہ سندھ کی سرزمین صرف قدیم تہذیبوں کی امین ہی نہیں بلکہ عظیم تاریخی شاہکاروں کی بھی وارث ہے۔ کوٹ ڈیجی قلعہ اسی عظیم ورثے کی ایک درخشاں مثال ہے، جو آج بھی اپنی خاموش زبان میں صدیوں پرانی تاریخ کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

بشکریہ پی بی سی خیر پور

اتنڑ، گردشِ قدم میں زندہ تہذیب

تحریر: شاہد اللہ خان

شام آہستہ آہستہ پہاڑوں کی اوٹ میں اُتر رہی ہے۔ گاؤں کے حجرے کے سامنے کُھلے میدان میں نوجوان جمع ہونے لگے ہیں۔ کہیں سفید شلوار قمیص کی جھلک ہے، کہیں سیاہ واسکٹ اور کہیں روایتی پگڑی کی وقار بھری شان۔ چند لمحوں بعد ڈھول پر پہلی تھاپ پڑتی ہے، ابتدا میں مدھم، جیسے کسی پرانی یاد نے خاموشی سے دستک دی ہو۔ پھر ایک اور تھاپ، پھر ایک اور، اور دیکھتے ہی دیکھتے قدم ایک دائرے میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ چہروں پر مسکراہٹ، آنکھوں میں اعتماد اور دلوں میں ایک عجیب سی حرارت جاگ اُٹھتی ہے۔ جیسے جیسے ڈھول کی رفتار بڑھتی ہے، ہر شخص کی انفرادی شناخت گویا ایک اجتماعی احساس میں تحلیل ہونے لگتی ہے۔ یہی وہ منظر ہے جسے پشتون معاشرہ صدیوں سے "اتنڑ" کے نام سے جانتا ہے۔

اگر کسی قوم کی تہذیب کو چند علامتوں میں سمیٹنا ہو تو پشتون معاشرے کے لیے اُن میں اتنڑ کا نام یقینا نمایاں ہوگا۔ یہ محض ایک رقص نہیں بلکہ ایک اجتماعی زبان ہے جس کے ذریعے خوشی بیان ہوتی ہے، دکھ بانٹا جاتا ہے، فتح کا جشن منایا جاتا ہے اور قومی وحدت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ دائرے میں شامل ہر شخص دوسرے کے قدموں سے ہم آہنگ ہو کر گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ معاشرہ اُسی وقت مضبوط ہوتا ہے جب اِس کے افراد ایک ہی تال پر چلنا سیکھ جائیں۔

پشتون تہذیب کی تاریخ میں اِس مخصوص رقص اتنڑ کو کبھی محض تفریح کے طور پر نہیں دیکھا گیا، بلکہ اسے ہمیشہ جذبے، نظم، جرأت اور اجتماعیت سے جوڑ کر سمجھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنڑ آج بھی شادیوں، عیدین، ثقافتی میلوں، قومی تقریبات اور کامیابی کی خوشیوں میں اسی جوش سے پیش کیا جاتا ہے جیسے صدیوں پہلے کیا جاتا تھا۔

لفظ "اتنڑ" یا پشتو میں "ات" کی اصل کے بارے میں مختلف آراء ملتی ہیں۔ بعض محققین اسے قدیم آریائی تہذیب سے جوڑتے ہیں جب کہ بعض اِسے اِسی خطے کی مقامی تہذیبی روایت قرار دیتے ہیں جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہی۔ اِس کی ابتداء کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنا آسان نہیں، تاہم اِس پر تقریباً اتفاق پایا جاتا ہے کہ یہ برصغیر اور افغانستان کے اِس پورے خطے کی قدیم ترین زندہ اجتماعی روایات میں سے ایک ہے جس نے سیاسی، مذہبی اور سماجی تبدیلیوں کے باوجود اپنی بنیادی شناخت برقرار رکھی۔

قدیم قبائلی زندگی جب باہمی تعاون اور مشترکہ دفاع پر قائم تھی، تب اتنڑ محض اظہارِ مسرت نہیں بلکہ تربیت کا ذریعہ بھی تھا۔ نوجوان اِس کے ذریعے جسمانی توازن، نظم وضبط اور اجتماعی ہم آہنگی سیکھتے تھے۔

اتنڑ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اِس میں کوئی ایک شخص مرکز نہیں بنتا۔ دائرہ کسی امیر و غریب، سردار و عام آدمی میں فرق نہیں کرتا۔ جب قدم ایک ہی تال پر اُٹھتے ہیں تو سب ایک ہی ثقافتی شناخت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دائرہ خود زندگی کی علامت محسوس ہوتا ہے، ایک ایسا سفر جس کا نہ کوئی واضح آغاز ہے نہ اختتام۔ نسلیں بدلتی رہتی ہیں مگر دائرہ برقرار رہتا ہے، قدم بدل جاتے ہیں مگر تال وہی رہتی ہے۔ شاید اِسی لیے اتنڑ صرف جسمانی حرکت نہیں بلکہ تہذیبی تسلسل کی زندہ تصویر ہے۔

پشتون معاشرے میں بچہ جب پہلی بار کسی خوشی کی تقریب میں اتنڑ دیکھتا ہے تو وہ دراصل اپنی تاریخ، اپنی شناخت اور اپنے آباؤ اجداد کی اجتماعی یادداشت سے پہلا تعارف حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ معروف محقق، شاعر اور ادیب پروفیسر زاریبت خان عارضی خٹک کے مطابق اتنڑ کو صرف رقص سمجھنا اِس کے مفہوم کو محدود کر دینا ہے۔ یہ دراصل پشتون تہذیب کی اجتماعی روح کا اظہار ہے جس میں تاریخ، مزاج، بہادری اور ثقافتی شعور ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اُن کے بقول جب ڈھول کی تھاپ پر لوگ دائرے میں حرکت کرتے ہیں تو وہ دراصل اپنی تہذیبی شناخت کی تجدید کر رہے ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اتنڑ نے زمانے کی بے شمار تبدیلیوں کے باوجود اپنی معنویت نہیں کھوئی۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں اتنڑ محض فن نہیں رہتا بلکہ ایک ایسی تہذیبی دستاویز بن جاتا ہے جسے نہ کاغذ پر لکھا گیا نہ پتھر پر کندہ کیا گیا بلکہ انسانوں کے قدموں اور اُن کے اجتماعی شعور میں محفوظ رکھا گیا۔

پشتون معاشرے کی نمایاں خصوصیت اِس کی اجتماعیت ہے۔ حجرہ، جرگہ، میلہ، عید، شادی یا فصل کی کٹائی، یہ سب مواقع فرد کو برادری کے قریب لاتے ہیں اور اتنڑ اِسی اجتماعی مزاج کا فطری اظہار ہے۔ یہاں کسی ایک شخص کی مہارت سے زیادہ پورے دائرے کی ہم آہنگی اہم ہوتی ہے؛ اگر ایک فرد تال سے ہٹ جائے تو پورے دائرے کا حُسن متاثر ہوتا ہے۔ گویا اتنڑ خاموشی سے یہ سبق دیتا ہے کہ مضبوط معاشرے کی بنیاد اُس وقت استوار ہوتی ہے جب ہر فرد اپنا کردار پوری ذمہ داری سے ادا کرے۔

اتنڑ کی اصل خوبصورتی اِس کی سادگی میں پوشیدہ ہے۔ اسے کسی شاندار اسٹیج یا مصنوعی آرائش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک کھلا میدان، چند پُرجوش نوجوان، ڈھول کی تھاپ اور خوشی بانٹنے والے لوگ، یہی اِس کی پوری دُنیا ہے۔ اِسی لیے جب یہ پہاڑوں کے دامن یا کسی گاؤں کی کچی گلی میں کیا جاتا ہے تو اِس کا حُسن کئی گنا بڑھ جاتا ہے، جیسے فطرت، موسیقی اور انسان ایک ہی تال میں سانس لے رہے ہوں۔

اتنڑ کی جان اِس کی موسیقی ہے، اور موسیقی کی جان ڈھول کی تھاپ۔ کئی علاقوں میں ڈھول کے ساتھ رباب اور سُرنئ بھی بجائی جاتی ہے، جس سے ماحول میں ایک خاص، مگر خالص ثقافتی وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ پشتون لوک ادب میں بھی اتنڑ کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ بعض ٹپوں میں محبوب کو دائرے میں دیکھنے کی خواہش بیان ہوتی ہے تو بعض رزمیہ اشعار میں فتح کے بعد اتنڑ کو جشن کی علامت بنایا جاتا ہے۔ ماہرِ تعلیم اور پشتو لوک ادب کے شناسا ڈاکٹر انعام اللہ انعام کے مطابق اتنڑ کو پشتو لوک شاعری اور موسیقی سے الگ کر کے سمجھنا ممکن نہیں؛ رقص، موسیقی اور شاعری ایک ہی ثقافتی تجربے کے مختلف رنگ ہیں، اور جب یہ تینوں ایک ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں تو محض ایک تقریب نہیں بلکہ پوری تہذیب اپنی موجودگی کا اعلان کرتی ہے۔

شادی بیاہ کی محفلوں میں گائے جانے والے گیت محبت، خوش بختی اور اجتماعی مسرت کے جذبات سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اِس کے برعکس جب اتنڑ کسی قومی اجتماع، احتجاج یا فتح کے موقع پر کیا جاتا ہے تو شاعری کا رنگ بھی بدل جاتا ہے؛ یہاں رزمیہ اشعار، ولولہ انگیز ٹپے اور حماسی نغمے فضا میں گونجتے ہیں، جن میں آزادی، غیرت، وفاداری اور استقامت جیسے مضامین نمایاں ہوتے ہیں۔ گویا اتنڑ موقع کے مطابق اپنی زبان خود اختیار کر لیتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ محض ثقافتی تقریب سے بڑھ کر ایک سماجی زبان بن جاتا ہے، جس میں الفاظ کم اور علامتیں زیادہ ہوتی ہیں۔

پشتون معاشرہ جغرافیائی اعتبار سے جتنا وسیع ہے، اتنڑ کے رنگ بھی اتنے ہی متنوع ہیں، اگرچہ بنیادی اصول ہر جگہ ایک ہی رہتا ہے۔ خٹک اتنڑ میں نظم، تیزی اور جسمانی مہارت نمایاں ہوتی ہے، وزیرستان کے علاقوں میں ڈھول کی گونج زیادہ بلند اور جذبہ زیادہ بے ساختہ محسوس ہوتا ہے، جہاں وزیر اور محسود قبائل کے اتنڑ میں طاقت، خود اعتمادی اور قبائلی وقار نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ بنوں، لکی مروت اور کرک کے علاقوں میں یہ مقامی لوک ثقافت کے ساتھ مل کر ایک منفرد صورت اختیار کر لیتا ہے، جہاں شادی بیاہ ہو یا عید کی خوشیاں، ڈھول کی پہلی تھاپ گویا خوشی کے باقاعدہ آغاز کا اعلان ہوتی ہے۔ جنوبی خیبر پختونخوا میں یہی روایت ایک اور پہلو بھی رکھتی ہے: جب کسی قومی مسئلے پر لوگ اکٹھے ہوں یا کوئی تاریخی کامیابی سامنے ہو تو ڈھول کی تھاپ ایک نئے مفہوم کے ساتھ سنائی دیتی ہے، اور دائرے میں شامل نوجوانوں کے قدم اپنے اجتماعی عزم کا اظہار بن جاتے ہیں۔

پشتون معاشرے میں مردوں اور خواتین کی اتنڑ کی روایت بھی اپنی سماجی ساخت کی عکاسی کرتی ہے۔ مرد عموماً حجروں، چوکوں، اور کھلے میدانوں میں اجتماعی صورت میں اتنڑ کرتے ہیں، جہاں ہر عمر کے افراد شریک ہوتے ہیں، جبکہ خواتین گھروں کے اندر شادی بیاہ، نکاح اور عید کے موقع پر اتنڑ کرتی ہیں۔ محفلیں الگ ضرور ہوتی ہیں مگر مقصد ایک ہی ہوتا ہے: خوشی کو اجتماعی طور پر منانا اور روایت کو زندہ رکھنا۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اتنڑ میں کسی پیشہ ور رقاص کی ضرورت نہیں ہوتی؛ یہاں ہر وہ شخص شامل ہو سکتا ہے جو اِس روایت سے محبت رکھتا ہو۔ یہ رقص تماشائی پیدا نہیں کرتا بلکہ شریک پیدا کرتا ہے، اور یہی اجتماعیت اسے دنیا کے بہت سے دوسرے روایتی رقصوں سے ممتاز کرتی ہے۔

پشتون ولی، جو پشتون معاشرے کا غیر تحریری ضابطۂ حیات سمجھا جاتا ہے، انسان کو عزت، غیرت، وفاداری، مہمان نوازی، جرأت اور اجتماعی ذمہ داری کا درس دیتا ہے، اور شاید کسی ثقافتی روایت میں اِن اقدار کا عملی اظہار اتنڑ سے زیادہ نمایاں کہیں نظر نہیں آتا۔ اِس رقص میں شریک ہر شخص اپنے انفرادی وجود کو اجتماعی دائرے کا حصہ بنا دیتا ہے۔

یہاں نہ کوئی سردار نمایاں ہوتا ہے نہ عام آدمی، سب ایک ہی تال پر قدم اُٹھاتے ہیں۔ پروفیسر عارضی خٹک کے بقول اتنڑ کا سب سے بڑا پیغام یہی ہے کہ قومیں صرف تاریخ پڑھنے سے زندہ نہیں رہتیں بلکہ اپنی زندہ روایات سے وابستگی کے ذریعے اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں۔

آج جب تیز رفتار شہری زندگی اور ڈیجیٹل ذرائع نے روایتی میل جول کو محدود کر دیا ہے، ایسے میں اتنڑ کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ یہ نئی نسل کو یاد دلاتا ہے کہ ثقافت صرف عجائب گھروں میں محفوظ اشیاء کا نام نہیں بلکہ وہ زندہ روایت ہے جو لوگوں کے رویوں، زبان، موسیقی اور اجتماعی شعور میں سانس لیتی ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں ذرائع ابلاغ، اسٹیج کلچر اور سوشل میڈیا نے اِس قدیم روایت کو نئی شہرت بھی دی ہے اور نئے چیلنجز سے بھی دوچار کیا ہے۔ آج یہ صرف دیہات کے میدانوں اور شادیوں تک محدود نہیں رہا بلکہ قومی ثقافتی میلوں، جامعات اور بین الاقوامی نمائشوں میں بھی پیش کیا جاتا ہے، جو اپنی جگہ خوش آئند ہے کیونکہ اِس سے نئی نسل اپنی ثقافت سے متعارف ہو رہی ہے۔ البتہ کئی ثقافتی ماہرین کا خیال ہے کہ جب اتنڑ کو محض اسٹیج کی کشش یا مقابلے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے تو مصنوعی روشنیوں، ریکارڈ شدہ موسیقی اور مقررہ کوریوگرافی کے باعث اِس کی بے ساختگی کہیں کم ہو جاتی ہے۔ تاہم اِس روایت کی اصل بقاء کسی ادارے یا اسٹیج کی محتاج نہیں بلکہ اِس کی عوامی بنیاد میں پوشیدہ ہے۔ جب تک گاؤں کے حجرے میں ڈھول کی پہلی تھاپ پر نوجوان بے اختیار دائرہ بنا لیتے ہیں، جب تک بزرگ مسکرا کر بچوں کو اِس میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے ہیں اور خواتین اپنے گھروں میں یہ روایت زندہ رکھتی ہیں، تب تک اتنڑ محض ثقافتی مظاہرہ نہیں بلکہ ایک زندہ تہذیب رہے گا۔

بنوں، وزیرستان، لکی مروت، کرک، خیبر، سوات یا پشاور: جغرافیہ بدل جاتا ہے مگر ڈھول کی پہلی تھاپ سنتے ہی جو دائرہ بنتا ہے وہ ایک ہی پیغام دیتا ہے کہ تہذیبیں اپنی زبان، اپنے ادب، اپنے فن اور اپنی روایات سے پہچانی جاتی ہیں۔ اتنڑ اسی پہچان کا ایک روشن استعارہ ہے۔

جب رات کے آخری پہر ڈھول کی تھاپ مدھم ہونے لگتی ہے، رقص کے دائرے آہستہ آہستہ ٹوٹ جاتے ہیں اور لوگ اپنے گھروں کو لوٹنے لگتے ہیں تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ محفل ختم ہو گئی۔ لیکن حقیقت میں اتنڑ وہیں ختم نہیں ہوتا، وہ شریک ہونے والوں کے دلوں میں، بچوں کی یادداشت میں اور بزرگوں کی مسکراہٹ میں زندہ رہتا ہے۔ شاید اِسی لیے اسے صرف ایک رقص کہنا اِس کی عظمت کو محدود کر دینا ہے۔ یہ پشتون قوم کی تاریخ کا چلتا پھرتا باب ہے، اِس کی تہذیب کی دھڑکن اور اِس کی ثقافتی شناخت کی روشن علامت۔ جب تک ڈھول کی تھاپ پر قدم ہم آہنگ رہیں گے، جب تک رزمیہ ٹپے ولولہ پیدا کرتے رہیں گے اور خوشی کے گیت نئی نسل کی زبان پر رہیں گے، تب تک اتنڑ بھی زندہ رہے گا، اور اِس کے ساتھ زندہ رہے گی ایک ایسی تہذیب جس نے اپنے ماضی کو فراموش کرنے کے بجائے اِسے اپنے قدموں کی گردش میں محفوظ کر لیا ہے۔

اتنڑ ہمیں یہی سبق دیتا ہے کہ قوموں کی اصل طاقت صرف اُن کے ہتھیاروں یا عمارتوں میں نہیں، بلکہ اُن روایات میں ہوتی ہے جو لوگوں کو ایک دائرے میں کھڑا کر کے یہ احساس دلاتی ہیں کہ اُن کی شناخت مشترک ہے، اُن کی تاریخ مشترک ہے، اور اُن کا مستقبل بھی اُسی وقت روشن ہو گا جب وہ اپنی تہذیبی جڑوں سے جُڑے رہیں گے۔

بشکریہ پی بی سی بنوں

پشتو بھولے بسرے نغمے اور ریکارڈنگ کمپنیاں

بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں مس گوہر جان کی آواز میں پہلا پشتو نغمہ ریکارڈ ہوا

تحریر: محمد اسلم خان

ویسے تو عالمی سطح پر آواز کی ریکارڈنگ کا تجربہ 1877ء میں ہوا لیکن اگر برصغیر میں موسیقی کی ریکارڈنگ کا جائزہ لیا جائے تو اِس حوالے سے برطانیہ میں "ہز ماسٹر وائس" کے نام سے قائم ایک ریکارڈنگ کمپنی نے انگریزی، اُردو، فارسی اور دیگر زبانوں کے ساتھ پشتو میں نغموں کی ریکارڈنگ کا فیصلہ کیا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہز ماسٹر وائس کمپنی نے پشتو اور دیگر زبانوں میں نغموں کی ریکارڈنگ کے لئے ہندوستان سے ایک مشہور گلوکارہ مس گوہر جان جو کتھک رقص میں بھی مہارت رکھتی تھیں، کا انتخاب کیا اور برطانیہ میں اُن کی آواز میں دیگر زبانوں کے نغموں کے ساتھ ساتھ دو عدد پشتو نغمے بھی ریکارڈ کئے گئے جو ڈسک کی شکل میں ہندوستان اور خصوصاً پشاور پہنچے۔ اُس زمانے میں صرف خان خوانین کے پاس گراموفون ہوا کرتے تھے اور سرِ شام علاقے کے لوگ گراموفون کے ذریعے نغمے سُن کر محظوظ ہوتے تھے۔ جب لوگوں نے پشتو نغمہ سُنا تو گوہر جان جو کہ بنیادی طور پر افغانستان سے تعلق رکھتی تھیں اور مادری زبان فارسی (دری) تھی، اُنہوں نے خود اپنی آواز میں نغمے کے اختتام پر کہا "مس گوھر جان کلکتہ فرام افغانستان"۔ ہز ماسٹر وائس کا یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا اور اِس طرح اُنہوں نے کلکتہ میں 1904ء میں اِسی نام (HMV) سے ریکارڈنگ کمپنی قائم کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں بجلی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اِس لئے بیٹری کے ذریعے تمام مشینری چلا کر گراموفون ڈسک میں ہندوستان کی تمام زبانوں میں نغمے ریکارڈ کرنا شروع ہوئے۔ HMV کمپنی گراموفون بھی بناتی تھی اور ساتھ ہی گراموفون میں استعمال ہونے والی سوئی جس سے صرف ایک نغمہ بجتا اور پھر دوسرے نغمے کے لیئے سوئی تبدیل کی جاتی تھی۔ اِسی طرح 1910ء میں مرد فنکاروں میں پشاور کے گلوکار اکرم جان کو کلکتہ بلا کر اُن کی آواز میں رحمان بابا کا صوفیانہ کلام "زہ بلبل ستا د وصال یم بوستان سہ کڑم" ریکارڈ کیا گیا۔ جب یہ ڈسک پختون علاقوں میں پہنچی تو اکرم جان اور کمپنی HMV کو بہت پذیرائی ملی۔ پھر یہاں سے بہت سارے فنکاروں نے کلکتہ جا کر اپنی آوازوں میں پشتو نغمے ریکارڈ کرنا شروع کئے جن میں سید محمد، عبدالرحمان، سلطان جان اور زنانہ گلوکاروں میں حنیفہ، قدر جان، سرور جان، مریان جان اور محبوب جان کے نام شامل ہیں۔ اِسی طرح سے جب بجلی کی سہولت آئی تو HMV کے علاوہ بھی ریکارڈنگ کمپنیاں دھڑا دھڑ قائم ہونے لگیں جن میں بانگافون، زونوفون، جینوفون، کولمبیا، ریگل، گلشن، ینگ انڈیا اور دیگر بہت ساری کمپنیاں قائم ہوئیں۔ اُن میں خصوصاً بانگافون اور گلشن کمپنیوں نے پشاور میں باقاعدہ ڈیلر مقرر کئے۔ بانگافون نے پشاور صدر بازار میں جہاں اب کمپنی باغ ہے، وہاں ٹریڈنگ کے نام سے ڈیلر مقرر کیا۔ گلشن کمپنی نے خیبر بازار کابلی گیٹ کے ساتھ بجاج اینڈ کمپنی کے نام سے ڈیلر مقرر کیا جو گراموفون، سوئی اور ڈسک فروخت کرتے تھے۔ اِنہی ڈیلرز کے ذریعے پشاور اور مردان سے فنکاروں کو بذریعہ ریل گاڑی کلکتہ اور دہلی لے جایا جاتا تھا اور اُن کی سُریلی آواز میں پشتو نغمے ریکارڈ کئے جاتے۔ بانگافون کمپنی ایک سکھ سردار سادھو سنگھ کی ملکیت تھی اور گلشن ایک ہندو سیٹھ کی۔ اِن دو کمپنیوں نے بہت سارے پشتو گیت ریکارڈ کئے۔ بانگافون کمپنی میں پہلا پشتو نغمہ صحبت د مرغز کی آواز میں ریکارڈ ہوا جس کے بول تھے "روز محشر بہ شی آشکارہ نبی، بیا بہ واخلی دامت سھارانبی"۔

اِن دونوں کمپنیوں نے باقاعدہ، موسیقاروں کو ماہانہ اُجرت پر رکھ لیا جس میں مشہور میوزک ڈائریکٹر دلبر راج، گل میر، خوشمیر اور پذیر خان یہ تینوں سارنگی، سریندہ نواز تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی اول میر طبلہ نواز تھے۔ یہ میوزیشن مستقل طور پر وہاں رہتے تھے۔ مشہور پشتو شاعر امیر حمزہ شینواری بھی گلشن کمپنی میں باقاعدہ ماہانہ اُجرت پر ملازم تھے۔ وہ اِن فنکاروں کے لئے نغمے بھی لکھا کرتے تھے اور ساتھ ہی رباب بھی خود بجاتے تھے۔ حمزہ شینواری نے کلکتہ میں تھیٹر کے لئے بھی ڈرامے تحریر کئے اور چند پشتو فنکاروں کو بطور تھیٹر آرٹسٹ اُنہوں نے ہی متعارف کروایا جس میں، صبر النساء دو بہنیں بھی تھیں۔ مرد فنکاروں میں ماسٹر مظفر خان، انذر گل، زرداد، سبز علی خان تھیٹر میں ڈرامے پیش کرتے تھے۔ پھر یہی ڈرامے، گلشن کمپنی میں بھی ڈسک پر ریکارڈ کئے گئے۔ اُن میں لیلیٰ مجنون، د پختون وادہ (شادی)، ہوائی جہاز، خوانئ، پیریانئ وغیرہ شامل ہیں جو کہ اب ریڈیو پاکستان پشاور کی لائبریری کی زینت ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق 1946ء تک دہلی اور کلکتہ میں تقریباً پانچ ہزار پشتو گیت ڈسک پر ثبت ہو چکے ہیں۔ پھر جب ہندوستان تقسیم ہوا تو ہز ماسٹر وائس کمپنی نے پشاور ڈبگری بازار میں دو کمروں پر مشتمل ایک ریکارڈنگ اسٹوڈیو قائم کیا جس میں اُن تمام فنکاروں کے ساتھ جو نغمے ریکارڈ کروانے کلکتہ اور دہلی جاتے تھے، مثلاً خانزادہ، سبز علی خان، چشتی چمن جان، روشن زری وغیرہ کے علاوہ، شیر محمد شیرے، انسان شاہ، ہدایت اللہ، باچا زرین جان، گلنار بیگم، کشور سلطان، گلزار بیگم اور تجریان وغیرہ سے بھی سینکڑوں نغمے ڈسک پر ثبت کئے۔ جب ریڈیو پاکستان پشاور سے تیر ھیر آوازنہ کے نام سے مئی 2000ء میں پروگرام شروع ہوا تو اُس کے پروڈیوسر لائق زادہ لائق اور میزبان ہیں راقم الحروف تھا اور ہم نے سامعین کو یہ کہہ کر گزارش کی کہ اگر یہ نغمے کسی کے پاس ہیں تو ریڈیو پاکستان پشاور کو مہیا کریں اور ہم ہر نغمے کے ساتھ مہیا کرنے والے کا نام لے کر نشر کریں گے تو یہ سلسلہ اُس وقت سے تاحال جاری و ساری ہے۔

بشکریہ پی بی سی پشاور

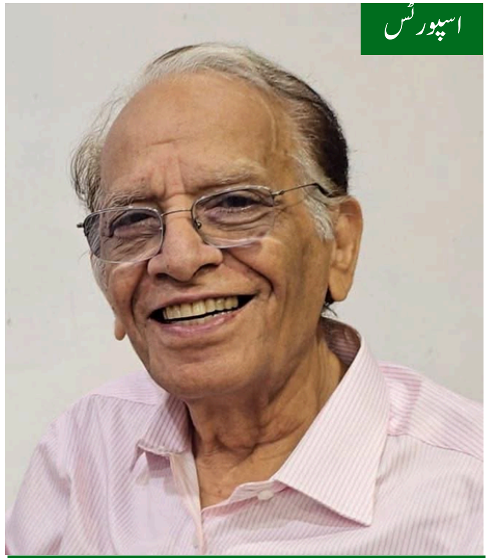

قمر احمد، نامور کرکٹ صحافی کی رحلت

انیس الرحمن

کہا جاتا ہے کہ ریکارڈز بنتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔ جلد یا بدیر اُنہیں ٹوٹنا ہوتا ہے لیکن کچھ ریکارڈز ایسے ہوتے ہیں جن کا ٹوٹنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کھیلوں کی بات کی جائے تو اسکواش لیجنڈ جہانگیر خان کا مسلسل 555 میچوں تک ناقابلِ شکست رہنے کا ریکارڈ، یہ کسی بھی انفرادی یا اجتماعی کھیل میں مسلسل فتح کا ایک ایسا ریکارڈ ہے جسے توڑنے کا امکان تو کیا اِس کے بارے میں تصور کرنا بھی دیوانے کا خواب ہی لگتا ہے۔ کھیلوں میں ریکارڈ بنانے یا توڑنے کی بات ہو تو کھلاڑیوں کا نام ہی ذہن میں آتا ہے لیکن کھلاڑیوں کی کارکردگی کی کوریج کرنے والا، اُن کے بارے میں لکھنے والا ایک شعبہ ایسا ہے جو ہے تو انتہائی اہم لیکن اُسے اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جس کا وہ حقدار ہے۔ ایک اسپورٹس کا صحافی۔

پاکستان کا سب سے کھیلا، دیکھا اور پسند کیا جانے والا کھیل کرکٹ ہے۔ اِس پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن اِس کے لیے یہ وقت درست نہیں۔ کرکٹ کی کوریج تقریباً تمام کھیلوں کے صحافی کرتے ہیں لیکن پاکستان میں یہ اعزاز مرحوم قمر احمد کو حاصل ہے کہ اُنہوں نے ساڑھے چار سو سے زائد ٹیسٹ میچ اور سات سو سے زائد ون ڈے انٹرنیشنل کور کرنے کے علاوہ اپنے تقریباً 60 سالہ صحافی اور رپورٹنگ کریئر میں نو ورلڈ کپ بھی کور کیئے۔ یہ ایک ایسا ریکارڈ ہے جو آج تک کسی اور کرکٹ صحافی اور کمنٹ یٹر کو حاصل نہیں ہوا۔

قمر احمد 23 اکتوبر 1937ء کو مغل سرائے بھارت میں پیدا ہوئے اور 18 جون 2026ء کو کراچی میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اُنہوں نے اپنے فرسٹ کلاس کیریئر میں حیدر آباد سندھ کی نمائندگی کرتے ہوئے 17 فرسٹ کلاس میچ کھیلے جس میں اُنہوں نے 371 رنز بنانے کے علاوہ اپنی لیفٹ آرم اسپن باؤلنگ سے 36 وکٹیں بھی حاصل کیں۔ اُنہوں نے حیدر آباد کی ٹیم کی قیادت بھی کی۔

قمر احمد ایک منجھے ہوئے کرکٹ جرنلسٹ، رائٹر تھے۔ اُنہوں نے دنیا کے بے شمار اخبارات، رسائل کے لیے رپورٹنگ کی اور مضامین لکھے۔ ریڈیو پاکستان کے علاوہ بی بی سی، ریڈیو فائیو لائیو، اسسٹریلین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن، نیوزی لینڈ ریڈیو سمیت دنیا کے بیشتر ریڈیو کے لیے براہِ راست کمنٹری کی۔ قمر احمد نے 24 فروری سے چار مارچ 2006ء کے دوران کراچی میں منعقدہ اے بی این ایمرو کپ ٹی ٹونٹی ٹورنامنٹ میں ریڈیو پاکستان کے لیے کمنٹری کے فرائض بھی انجام دیے جس کے انچارج پروڈیوسر ہونے کا اعزاز راقم کو حاصل ہے۔

قمر احمد 1964ء میں صرف 27 برس کی عمر میں انگلینڈ چلے گئے اور اپنے کرکٹ صحافت کے کیریئر کی چار دہائیاں وہاں گزاریں۔ اِس سے قبل اُنہوں نے کراچی میں 1961ء سے 1963ء تک پی پی آئی نیوز ایجنسی میں کام کیا۔ شاید یہی اُن کی واحد باقاعدہ ملازمت تھی۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے ساری زندگی فری لانسر کام کیا۔

اُنہوں نے بنگلہ دیش کے علاوہ ہر ملک میں ٹیسٹ میچ اور ون ڈے انٹرنیشنل کور کیے۔ اُنہوں نے دنیا کے معروف اخبارات اور جرائد مثلاً ڈیلی ٹیلی گراف، دی ٹائمز، دی گارڈین، سنڈے ٹیلی گراف، سنڈے ٹائمز، دی آبزرور، ڈیلی میل، دی میل آن سنڈے، سنڈے ایکسپریس، ڈیلی ایکسپریس اور ڈون کے علاوہ دیگر کئی بین الاقوامی اداروں کے لیے بھی لکھا اور اے بی سی کرکٹ ایئر بک، بی اینڈ ایچ ویسٹ انڈیز کرکٹ اینول، ڈیلی ٹیلی گراف کرکٹ اینول، اے بی سی کرکٹ ایئر بک، ڈیلی ٹیلی گراف کرکٹ اینول، ساؤتھ افریقن کرکٹ اینول کے علاوہ مشہور نیوز ایجنسیز رائٹر اور اے ایف پی کے لیے بھی خدمات انجام دیں۔ وزڈن کرکٹرز المونک، وزڈن آسٹریلیا اور وزڈن انڈیا المونک میں بھی اُن کے آرٹیکل شائع ہوتے رہے۔ اُنہوں نے ریڈیو پاکستان کے علاوہ آسٹریلین اور نیوزی لینڈ کے ریڈیو کے لیے بھی کمنٹری کی۔ اُنہوں نے کرکٹ پر کئی کتابیں لکھیں اور حنیف محمد، وقار حسن کی آٹو بائیو گرافی لکھنے میں معاونت کی۔ چند برس قبل اُن کی سوانح حیات منظرِ عام پر آئی جس کا نام "فارمور دین اے گیم" ہے جو بہت دلچسپ ہے۔

بشکریہ پی بی سی کراچی

میٹھے بول

انصار نام کا ایک لڑکا تھا۔ اُس کے ماں باپ بڑے مالدار تھے۔ بڑے لاڈ پیار سے اُس کو پالا پوسا تھا۔ اُس کی ہر بات پوری کی جاتی تھی۔ جتنا بھی روپیہ وہ مانگتا تھا اُس کے ماں باپ اُس کو دے دیتے تھے ابھی وہ چھوٹا تھا کہ اُس کو اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اُس کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ وقت پر اسکول جاتا۔ وقت پر واپس آتا لیکن اُس میں ایک برا عیب تھا۔ اُس کی زبان بڑی گندی تھی۔ وہ گالیاں بہت دیتا تھا۔ کسی سے بھی گالی کے سوا بات نہیں کرتا تھا۔ گھر کے سب لوگ چھوٹے بڑے اُس سے ناخوش رہتے تھے اور اسکول کے تمام ساتھی بھی اِسی وجہ سے اُس سے نفرت کرتے تھے۔

انصار اپنے دوستوں کو خوب کھلاتا پلاتا تھا۔ کھانے پینے میں تو وہ اُس کے ساتھ شریک رہتے تھے لیکن اُس کے بعد وہ کسی بہانے سے ایک ایک کر کے اُس کے پاس سے کھسک جاتے اور وہ اکیلا رہ جاتا۔ اِس بات کا اُس کو بڑا دکھ ہوتا تھا کہ اپنے دوستوں پر اِس قدر روپیہ خرچ کرنے پر بھی کوئی اُس سے زیادہ ملنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن اُس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ صرف اُس کی گندی زبان کی وجہ سے ہر ایک اُس سے نفرت کرتا ہے۔

یک دن انصار کہیں جا رہا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ راستے میں ایک درخت پر بہت سے کوئے جمع ہیں اور کائیں کائیں کا شور مچا رہے ہیں۔ شریر لڑکے اُن پر پتھر پھینک رہے ہیں اور راستہ چلنے والے نفرت سے اُن کوؤں کی طرف دیکھتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ انصار وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ دیکھا سڑک کے کنارے ایک میدان میں شامیانہ لگا ہوا ہے۔ وہاں کرسیاں اور صوفے بچھے ہوئے ہیں۔ لوگ اُن پر بیٹھے ہیں۔ درمیان میں پرندوں کا ایک تاجر چاندی کا ایک خوشنما پنجرا لئے کھڑا ہے جس میں ایک نہایت ہی خوبصورت پرندہ بڑی سُریلی آواز میں بول رہا ہے جس کی دلکش آواز پر لوگ بہت خوش ہو رہے ہیں۔ انصار نے دیکھا کہ وہاں اُس پرندے کو نیلام کیا جا رہا ہے اور خریدار ایک سے بڑھ کر ایک دام لگا رہے ہیں۔ انصار کو بہت بڑا تعجب ہوا کہ اِس ننھے سے پرندے کی اتنی زیادہ قیمت لگ رہی ہے۔ اُس سے نہ رہا گیا اور پاس ہی کھڑے ہوئے ایک شخص سے پوچھ بیٹھا کہ اتنے ننھے سے پرندے کے اِس قدر اونچے دام کیوں لگ رہے ہیں۔ اُس نے جواب دیا "میاں جی اِس کے ڈیل ڈول کو کیا دیکھ رہے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ اِس کی آواز میں کیا جادو ہے کہ سننے والے جھوم رہے ہیں۔"

اُس نے کہا "یہ اِس کے میٹھے بول ہی تو ہیں جن کی وجہ سے دام بڑھتے بڑھتے آسمان سے باتیں کرنے لگے ہیں۔" تھوڑی دیر تک تو انصار یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے سوچا کہ کوؤں سے لوگوں کی نفرت اور اِس ننھے سے پرندے سے لوگوں کی رغبت کی کیا وجہ ہے۔ ذرا سے غور کے بعد یہ بات بھی اُس کی سمجھ میں آ گئی کہ مجھ سے لوگوں کی نفرت کا یہی سبب ہے کہ میری زبان خراب ہے۔ اگر میں بھی اچھی باتیں کیا کروں تو لوگ مجھے پسند کرنے لگیں گے۔ اِس کے بعد اُس نے آئندہ پھر کبھی گالی نہ بکنے کا پکا وعدہ کر لیا۔ پھر تو گھر کے تمام لوگ اور سکول کے سب ساتھی انصار کو بہت زیادہ چاہنے لگے۔

آہنگ 1974ء